اقبال لاہور میں
مرتبہ حمیرا جمیل

اقبال لاہور میں

حمیرا جمیل

DUA PUBLICATIONS

انتساب

دعا پبلی کیشنز لاہور کے سربراہ زاہد شیخ صاحب
کے نام

فہرست

اقبال، لاہور اور حمیرا پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی

لاہور کی انتخابی سرگرمیاں اور خانوادۂ اقبال میاں ساجد علی

اقبال شناسی ۔۔۔ ایک جائزہ حمیرا جمیل/ڈاکٹر طاہر عباس طیب

گفتنی حمیرا جمیل

۱-لاہور کا تاریخی وادبی پس منظر

۲-علامہ اقبال کے قیام لاہور کا اجمالی جائزہ

۳-اقبال اور لاہور

۴-تصانیف اقبال لاہور میں

۵-اقبالیاتی ادارے، مقالات

اقبال، لاہور اور حمیرا جمیل

یہ شہر لاہور کے لیے بہت بڑی سعادت ہے کہ عالم اسلام کے سب سے بڑے مفکر حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ اس شہر میں گزرا۔ وہ اس شہر میں اقبال سے علامہ اقبال بنے۔ ان کے افکار کے نور کی کرنیں اس شہر میں پھوٹیں اور دنیا بھر میں پھیل گئیں انہیں اس شہر سے یک گونہ محبت تھی آخری عمر میں تو وہ اس شہر مسعود سے باہر جانا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ شاہی مسجد انہیں مسجد قرطبہ کے جلال و جمال کی یاد دلاتی تھی اور اُمت مسلمہ کی عظمت رفتہ کے نقوش میں گم رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس مسجد کے صدر دروازے کے ساتھ ہی اس عظیم ہستی کی لحد ہے۔ جس کے بارے میں خود فرما گئے

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو اس نے بتایا رازِ الوندی

لاہور کو اقبال کے ذکر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس شہر کے مختلف مقامات، شخصیات، عمارات اور دیگر متعلقات کا ذکر اقبال کے حوالے سے مختلف مضامین اور کتب میں ملتا ہے۔ تاہم ایک مربوط اور جامع انداز میں اس شہر اور اقبال کے حوالے سے ایک باقاعدہ کتاب ترتیب دینا حمیرا جمیل کی قابل قدر کوشش اور سعادت

ہے۔حمیرا جمیل نے اس کتاب کے ذریعے حیاتِ اقبال کے بعض خفیہ گوشوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے بعض ایسی شخصیات منظر عام پر آئی ہیں جنہیں اس سے پہلے اہمیت حاصل نہیں تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ حمیرا جمیل کی کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے تحقیق کے نئے راستے کھلیں گے اور اقبال شناسی کے نئے باب وا ہوں گے۔طلبہ و طالبات اور تحقیق کا ذوق رکھنے والے سکالرز کے لیے یہ کتاب یقیناً بہت مفید ثابت ہوگی۔اس کتاب کی وجہ سے میرے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوا کہ ان تمام شہروں جن کے ساتھ کسی نہ کسی حوالے سے علامہ اقبال کی یادیں وابستہ ہیں کے بارے میں بھی کتب شائع ہونی چاہیں۔تحقیق کا سلسلہ ضرور آگے بڑھنا چاہیے۔یہ ایک نئے ڈھنگ کی تحقیق ہوگی۔جس کے لیے محققین کو حمیرا جمیل کا شکر گزار ہونا ہوگا۔میں خود بھی شکر گزار ہوں اور اس کمسن اسکالر کو تحقیق کا ایک نیا باب وا کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی

۳۱ دسمبر ۲۰۱۹ء

لاہور کی انتخابی سیاست اور خانوادۂ اقبال

لاہور جہاں علمی، ثقافتی، ادبی اور مذہبی سرگرمیوں کا گڑھ رہا ہے وہاں اس تاریخی شہر کی سیاسی سرگرمیاں بھی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔ مملکتِ خداداد پاکستان کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا، جن کی زندگی کا زیادہ حصہ لاہور میں ہی گزرا۔ لاہور سے نسبت کی وجہ سے ایران میں علامہ اقبال 'اقبال لاہوری' کے نام سے مشہور ہیں۔ لاہور ہی میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے حصول کے لیے قرارداد پیش کی گئی جسے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور کر لیا گیا تھا۔ آزاد مملکت کے حصول کے لیے جہاں پنجاب سے آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں پورے صوبے سے اکثریت حاصل کی وہیں لاہور کی تمام نشستیں بھی آل انڈیا مسلم لیگ نے حاصل کیں تھیں۔ لاہور کی انتخابی سیاست کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں کئی خاندانوں کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں جو انتخابی سیاسی سرگرمیوں میں شریک رہے۔ ایسا ہی ایک خاندان حکیم الامت علامہ محمد اقبال کا بھی ہے۔

علامہ اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے لیکن زندگی کا ایک بڑا حصہ لاہور میں گزارنے کی وجہ سے اُن کی سیاست بھی اسی شہر سے پروان چڑھی۔ جب اقبال کی

سیاسی زندگی پر نظر ڈالیں تو بلاشبہ ہمیں اُن کا وہ صدارتی خطبہ یاد ہے جو اُنہوں نے الہٰ آباد کے مقام پر ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو دیا' جس میں پاکستان کے قیام کی پیش گوئی کی تھی جو ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سچ ثابت ہوئی۔ علامہ اقبال ایک کامیاب سیاست دان بھی تھے اُنہوں نے پنجاب لجسلیٹیو اسمبلی کے لیے انتخاب بھی لڑا۔ جس کی مختصراً تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ۱۹۲۶ء میں دوسری مرتبہ پنجاب قانون ساز کونسل کے انتخابات ہوئے۔ اقبال کے احباب نے اُن سے اصرار کیا کہ وہ لاہور کے مسلم حلقے سے انتخابات میں حصہ لیں۔ اسی دوران میں جب میاں عبدالعزیز بیرسٹر نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اقبال کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوں گے بلکہ اِن کی مدد کریں گے تو اقبال اپریل ۱۹۲۶ء میں انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے۔ لاہور کے مسلم اخباروں نے بارہا تحریر کیا کہ اقبال جیسی شخصیت کو بلا مقابلہ کونسل کا رکن منتخب کیا جانا چاہیے' لیکن لاہور میں 'برادری نوازی' کی وبا کی موجودگی کے سبب دو اور حضرات مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ بہرحال ان میں سے ملک محمد حسین صدر بلدیہ لاہور نے اقبال کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا لیکن ملک محمد دین مقابلے پر ڈٹ رہے۔ اس لیے اقبال کو انتخابی جنگ کے میدان میں اترنا پڑا۔ پولنگ دو روز ہوئی ۲۳ نومبر کو لاہور شہر کے مسلم حلقے میں اور ۲۴ نومبر کو لاہور چھاؤنی کے حلقے میں ووٹنگ ہوئی۔ ۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو انتخابات کونسل کے نتائج کا سرکاری اعلان ضلع کچہری میں ہوا۔ اُس زمانے میں حلقہ کے کل ووٹروں کی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی جن میں سے تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار ووٹ ڈالے گئے۔ اقبال کو ۵۶۷۵ ووٹ ملے اور ملک محمد دین کو ۲۶۹۸ ووٹ ملے۔ اس طرح اقبال ۲۹۷۷ ووٹوں کے فرق سے کامیاب

قرار پائے۔

علامہ اقبال کا انتقال ۲۱اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ہوا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ عام انتخابات ۱۹۷۰ء میں ہوئے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات میں علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال نے لاہور سے الیکشن لڑا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو قومی اسمبلی کے لیے ووٹنگ ہوئی۔ جاوید اقبال نے لاہور کے حلقہ NW-60 Lahore-III سے الیکشن لڑا۔ جاوید اقبال پاکستان مسلم لیگ (کونسل) کے ٹکٹ پر یہاں سے پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کے مدِ مقابل تھے۔ یہ معرکہ ذوالفقار علی بھٹو نے ۷۸۱۳۲ ووٹ لے کر سر کیا جبکہ جاوید اقبال کو ۳۳۹۲۱ ووٹ پڑے۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان میں دوسری مرتبہ عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات میں علامہ اقبال کے داماد میاں صلاح الدین نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لیا۔ اُن کا انتخابی حلقہ NA-85 Lahore-V تھا۔ ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخابات میں میاں صلاح الدین نے ۵۱۱۷۱ ووٹ لے کر یہ انتخاب جیتا۔ ان کے مدِ مقابل پاکستان قومی اتحاد کے امیر حبیب اللہ خان سعدی نے ۳۱۴۹۸ ووٹ حاصل کیے۔ اس طرح یہ معرکہ میاں صلاح الدین نے ۱۹۶۷۳ ووٹوں کے فرق سے سر کیا۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ملک میں ایک مرتبہ پھر مارشل لاء نافذ کیا گیا۔ ضیاء الحق حکومت نے ملک میں نئے انتخابات کا اعلان کیا لیکن یہ انتخابات وعدے کے مطابق وقت پر نہ ہو سکے۔ بار بار وعدہ کر کے بالآخر انتخابات فروری ۱۹۸۵ء کو منعقد کروائے

گئے۔ ان انتخابات کی خاص بات یہ تھی کہ یہ انتخابات غیر سیاسی جماعتی بنیادوں پر ہوئے۔ علامہ اقبال کے داماد میاں صلاح الدین' جنہوں نے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حصہ لیا تھا۔ اُنہوں نے ان انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے بائیکاٹ کے باوجود آزادانہ حیثیت سے الیکشن لڑا۔ ان کا حلقہ انتخاب NA-87 Lahore-VII تھا۔ ان کے مدِ مقابل حافظ سلمان بٹ نے ۱۸۸۹۵ ووٹ حاصل کر کے یہ سیٹ جیتی۔ جبکہ میاں صلاح الدین دوسرے نمبر پر رہے اور اُنھوں نے ۱۵۳۷۷ ووٹ حاصل کیے۔

۱۹۸۸ء میں ایک مرتبہ پھر پاکستان میں انتخابات کا انعقاد ہوا۔ ان انتخابات میں پہلی مرتبہ خانوادۂ اقبال سے قومی اسمبلی کے بجائے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا گیا۔ ۱۹ نومبر ۱۹۸۸ء کو ملک بھر میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ علامہ اقبال کے نواسے اور میاں صلاح الدین کے فرزند میاں یوسف صلاح الدین نے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لیے انتخاب لڑا۔ اُن کا حلقہ PP-125 Lahore-X تھا۔ میاں یوسف صلاح الدین نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ۲۱۵۸۵ ووٹ حاصل کیے جبکہ اُن کے مدِ مقابل اسلامی جمہوری اتحاد کے چوہدری عبدالحمید نے ۱۵۴۹۰ ووٹ حاصل کیے۔ اس طرح اُنھوں نے یہ سیٹ ۶۰۹۵ ووٹوں کے فرق سے اپنے نام کی۔

۱۹۹۰ء کے انتخابات میں خاندانِ اقبال کی جانب سے کسی بھی شخصیت نے الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ہونے والے عام انتخابات میں علامہ اقبال کے نواسے میاں یوسف صلاح الدین نے قومی اسمبلی کی نشست کے لیے انتخاب لڑا۔

اُن کا حلقہ NA-96 Lahore-V تھا۔اس نشست سے کامیاب ہونے والے امیدوار پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کے میاں شہباز شریف تھے جنھوں نے ۵۵۸۵۷ ووٹ حاصل کیے تھے جبکہ میاں یوسف صلاح الدین جو کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر اس نشست سے امیدوار تھے' نے ۳۷۸۴۹ ووٹ حاصل کیے۔۱۹۹۷ء میں ہونے والے انتخابات میں خانوادۂ اقبال میں سے کسی شخصیت نے الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔البتہ فرزند اقبال' ڈاکٹر جاوید اقبال پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کی جانب سے سینیٹ کی نشست کے لیے منتخب کیے گئے۔۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۸ کے انتخابات میں بھی خانوادۂ اقبال سے کسی بھی شخصیت نے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔

۱۱ مئی ۲۰۱۳ء کے عام انتخابات میں خاندانِ اقبال سے ایک نئی شخصیت ولید اقبال نے پاکستان تحریکِ انصاف کے ٹکٹ پر عام انتخابات میں قومی اسمبلی کی نشست کے لیے انتخاب میں حصہ لیا۔ولید اقبال' علامہ اقبال کے پوتے ہیں اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ان کا حلقہ انتخاب NA-124 Lahore-VII تھا۔ اس حلقہ کے بہت سے علاقے اُن علاقوں پر مشتمل تھے جہاں سے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ولید اقبال کے والد ڈاکٹر جاوید اقبال نے قومی اسمبلی کی نشست کے لیے انتخاب میں حصہ لیا تھا۔اس نشست سے پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کے شیخ روحیل اصغر نے ۱۱۹۳۱۲ ووٹ حاصل کیے تھے اور کامیاب قرار پائے تھے۔جبکہ ولید اقبال دوسرے نمبر پر تھے اور اُنھوں نے ۴۲۵۶۱ ووٹ حاصل کیے تھے۔۲۵ جولائی ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات میں خانوادۂ اقبال میں سے کسی بھی شخصیت

نے الیکشن نہیں لڑا۔ بعد ازاں ۱۴ نومبر ۲۰۱۸ء کو سینیٹ کے انتخابات میں ولید اقبال پاکستان تحریکِ انصاف کی جانب سے کامیاب ہوئے۔ اِن کے مقابل پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کے سعود مجید تھے۔ ولید اقبال کو ۱۸۴ ووٹ ملے جبکہ مدمقابل ۱۷۶ ووٹ حاصل کر سکے۔

یہ ایک مختصر سا تجزیہ تھا جو لاہور کی انتخابی سیاست اور خانوادۂ اقبال کے حوالے سے پیش کیا گیا۔

میاں ساجد علی

رابطہ: 0300-4246143

ای میل: allamaiqbalstamps@gmail.com

اقبال شناسی ......ایک جائزہ

علامہ اقبال برصغیر کے عظیم شاعر، مفکر اور مصلح ہیں جنہوں نے اپنے عمیق خیالات اور انقلابی افکار کے اظہار کے لیے بیک وقت اردو فارسی اور انگریزی زبان کو وسیلہء اظہار بنایا۔ان کی شاعری اردو اور فارسی میں جبکہ خطبات اور مقالات انگریزی میں موجود ہیں۔ جبکہ انہوں نے مکاتیب اردو زبان میں لکھے۔ان کا فکر و فلسفہ محض شاعرانہ خیال یا فلسفیانہ تصور نہیں بلکہ ایک واضح حکمت عملی کا درجہ رکھتا ہے۔اقبال مفکرِ اسلام، حکیم الامت، شاعر مشرق، دانائے راز، ترجمانِ خودی اور نجانے کتنے ہی خطابات و القاب کے حق دار ہیں۔ ہر فرد اور ہر طبقے کا اپنا اقبال، وہی اقبال، جس نے پوری دنیائے ادب اور فکری رویوں کو متاثر کیا۔وہی اقبال جو دنیا بھر میں اردو بولنے والوں کی نہ صرف پہچان ہے بلکہ فخر و ناز کا باعث بھی ہے۔اسی نے قوم کو پستیوں سے نکال کر خود شناسی کا پیغام دیا۔ظاہر ہے کہ جو مسیحا نفس اپنے کلام سے اتنا بڑا کام لینا چاہتا ہو اس کے نزدیک پرانے الفاظ اور معانی اپنی حقیقت کھو بیٹھتے ہیں لہٰذا اس نے نئی تراکیب ایجاد کیں، نئے الفاظ وضع کیے اور بعض خاک افتادہ الفاظ کو اٹھایا اور ہمدوش ثریا بنا دیا۔ متبذل اور ناپسندیدہ معنوں میں استعمال ہونے والے الفاظ نئی معنوی شان و شوکت سے آشنا ہوئے ۔اقبال کے فارسی اور اردو کلام میں ہزاروں تازہ بتازہ اور نو بہ نو تراکیب اور الفاظ موجود ہیں۔ وہ چونکہ حقیقی معنوں میں علامہ تھے۔اس

لیے ان کے ذخیرہ الفاظ نے فارسی اور اردو کی علمی و ادبی دنیا کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا۔ سلیم احمد کہتے ہیں:

''اقبال ہمارے ماضی قریب کی عظیم ترین علمی، فکری اور سیاسی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔۔۔اس کے علاوہ وہ مشرق و مغرب کے فلسفوں سے بھی آگاہ اور عہد حاضر کے علوم مسائل سے باخبر ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی نظیر جدید مشرق میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ پھر وہ ایک ایسے تہذیبی اور سیاسی نظریئے کے بانی ہیں جس نے ایک ملک کو جنم دیا ہے اور ان کی یہ حیثیت ایسی ہے جو تاریخ عالم میں کسی شاعر یا مفکر کو حاصل نہیں ہوئی۔''(۱)

دنیائے علم و ادب، فلسفہ و سائنس اور تاریخ و سیاست میں اقبال ایک ایسی منفرد حیثیت حاصل کر چکے ہیں کہ مشرق و مغرب ان کی عظمت کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اقبال کو ''ممدوح عالم'' قرار دیتے ہیں:۔ ''آج کی تمام مہذب دنیا اقبال کے نام اور افکار سے واقفیت رکھتی ہے۔''(۲)

اقبال اپنے عہد کی مختلف تحریکات اور رجحانات کا نہ صرف گہرا شعور رکھتا تھا بلکہ اس کے صحت مند عناصر کو جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت سے بھی بہرور تھا۔ مغرب اور مشرق کے بیشتر ممالک کی زبانوں میں اُن کی شاعری کے تراجم ہو چکے ہیں اور متعدد ممالک کے دانشوروں نے اُن کے افکار و تصورات کی توضیح و تشریح کے لیے مقالات تحریر کیے اور کتابیں طبع کیں۔ علامہ اقبال کی صورت میں ہمیں وہ فلسفی شاعر ملتا ہے جسے مسلمانوں نے تو سر آنکھوں پر بٹھایا لیکن تعجب ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام والے مغرب یورپین ممالک اور اس نظام کے مخالف سوشلسٹ ممالک میں بھی علامہ اقبال کو

خراج تحسین پیش کیا گیا۔صرف چند ممالک کے معروف اقبال شناسوں کے ناموں سے پیغامِ اقبال کی عالمگیر مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔آر اے نکلسن، ہربرٹ ریڈ، اے جے آربری، ای ایم فاسٹر (برطانیہ)، ایساندرو بوزانی، جی توچی (اٹلی) اینا میری شمل (جرمنی) ایوا ماریووچ، لوس کلوڈ میتخ (فرانس)، ژاں ماریک (چیکوسلواکیہ)، بخوچوف، ایل آر گورڈن پولنسکایا، نکولائی گلیبوف، نتالیا پری گارنیا، ایم ٹی ستے نتیس (روس) یہ صرف چند نام ہیں ورنہ دنیا کی بیشتر اہم زبانوں میں علامہ کی شاعری کے تراجم ہوئے، افکار وتصورات کی صراحت میں مقالات تحریر کیے گئے اور کتابیں طبع کی گئیں۔

مسلم ممالک میں ایران، مصر، ترکی، افغانستان، مراکش، انڈونیشیا اور متعدد دیگر مسلم ممالک کے دانشوروں کی فکر اقبال سے دلچسپی اور اقبال شناسی کے فروغ کی وجہ بنی۔زبان کا اشتراک ذہنی روابط کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔چنانچہ یہ عالم ہے کہ علامہ اقبال ایران میں اسی طرح مقبول ومعروف ہیں جیسے کوئی مقامی شاعر۔اقبال شناسی برصغیر کی حدود عبور کر کے ایک ایسی عالمی روایت کا درجہ اختیار کرچکی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی رفعتوں اور نئی وسعتوں کو چھو رہی ہے۔منور مرزا لکھتے ہیں:

> ”علامہ اقبال کا کلام اوران کا فکر محض براعظم کی وسیع وعریض حدود تک ہی محدود نہ رہا بلکہ وہ سیاسی، جغرافیائی اور نسلی حدود کو عبور کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔آج علامہ اقبال کی حیثیت ایک بین الاقوامی مفکر اور معلم کی ہے اور یہ امر مسلم ملت کے لیے اور پاکستان کے لیے لائق صد فخر ہے۔“(۳)

جو لوگ اقبالیات یا اقبال شناسی کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں ان کو ذہن

میں رکھنا چاہیے کہ ان دو اصطلاحات کے اندر فرق موجود ہے۔ ''اقبالیات'' ایک شعبہ علم ہے، جس میں اول اقبال کی شعری وفکری تصانیف اور مقالات و مکاتیب و بیانات شامل ہیں اور دوم ایسی تمام تحریرات وتحقیقات جو حیات وتصانیف اقبال کے تشریحی و توضیحی اور تنقیدی مطالعات پر مبنی ہیں۔ جبکہ اقبال شناسی میں موجود لفظ "شناس" وضاحت کا متقاضی ہے مولوی سید احمد دہلوی نے "فرہنگ آصفیہ" میں لکھا ہے:۔

''شناس'' (ف) مرکبات میں) جیسے مردم شناس، قدر شناس، حق شناس وغیرہ یعنی آدمی کو پہچاننے۔ قدر جاننے اور حق کی تمیز کرنے والا ہے''۔ (۴)

اسی طرح وارث سرہندی ایم اے نے ''علمی اُردو لغت'' (جامع) میں یوں لکھا ہے:

''شناس'' [ف۔صف] فارسی مصدر ''شناختن'' کا امر جو اسم کے بعد آ کر اسے اسم فاعل بناتا ہے اور پہچاننے والا کے معنی دیتا ہے مثلاً "قدر شناس۔'' (۵)

اقبال شناسی وہ علمی روایت ہے جس کی بنیاد حیات و افکار اقبال کی تفہیم کے سلسلہ میں کی جانے والی اب تک کی کاوشوں کو قرار دیا جاتا ہے۔ اور اقبال شناسی کی روایت سے وابستہ اہل علم کو اقبال شناس، اقبال سکالر یا ماہر اقبال کہا جاتا ہے۔ قاضی مرحوم ایسے اصحاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

''اقبالین'' کی اصطلاح کو موزوں سمجھتے ہیں جنہوں نے اقبالیات کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے اور ان پر مستقل کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔ وہ ان کے لیے اقبال شناس کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔'' (۶)

پاکستان میں اقبال شناسی کے فروغ میں مختلف درسگاہوں کے اساتذہ کا کردار نہایت اہم رہا ہے جنہوں نے کلام وافکار اقبال کے ساتھ اپنی دلچسپی اوروابستگی کو اپنے عزیز طلبہ کے دلوں میں جا گزیں کیا اور اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنے۔ پروفیسر عابد علی عابد، صوفی تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر افتخار صدیقی، پروفیسر عبد الشکور احسن، ڈاکٹر وحید قریشی، منور مرزا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر نعیم احمد، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر آصف اعوان کے اسمائے گرامی اس ضمن میں چند مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایران کے ڈاکٹر احمد علی رجائی کے مطابق۔ ''اقبال ایک نودریافت براعظم کی مانند ہیں جس میں کتنی ہی دلآویز اور قابل غور چیزیں ہنوز بحث طلب ہیں۔''(۷)

ایک عالم کے دانشور اس نودریافت براعظم کی کشش اور دلآویزی کے حسن کے کھوج میں نظر آتے ہیں۔ عہد حاضر میں ہر جگہ اقبال شناس ملتے ہیں جنہوں نے اقبال شناسی کے مفہوم کو بہتر انداز سے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق قارئین کے سامنے سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا۔ تاکہ نسل نو پیغام اقبال سے استفادہ کر سکے۔ قدرت نے اقبال کو نورِ معرفت، بصیرت، شاعرانہ فطرت اور درد دل عطا کرنے میں کھول کر فیاضی کی تھی جس کی مثالیں تاریخ عالم میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اقبال علم، آزادی اور اجتہاد کا قائل تھا۔

اقبال نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے بنی نوع انسان کو اپنے حیات بخش پیغام سے نوازا۔ اُن کے احساس کمتری کو دور کر کے اُن میں خودی اور خودداری کا جذبہ

بیدار کیا۔عمل سے غافل قوم کو سعی پیہم کا درس دیا۔علامہ کی ولولہ انگیز شاعری نے مسلمانان برصغیر کو حریت فکر سے آشنا کیا۔اُن کے انقلابی فکر وفلسفہ سے عالم انسانیت کو بالعموم اور عالم اسلام کو بالخصوص ایک نیا جذبہ اور ولولہ ملا جس کی ضیاء پاشیوں سے عصر حاضر میں بھی تمام انسانیت بلا لحاظ مذہب وملت روشنی حاصل کرتی جارہی ہے۔سید ابو الحسن علی ندوی کہتے ہیں :۔"اقبال حکمت و فلسفہ اور دوسرے علوم نظری میں بھی اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں"۔(۸)

اقبال مسلمانان برصغیر کے ایک عظیم محسن ہیں،انہوں نے مسلمانوں کو غیر اسلامی نظریات سے مرعوب نہ ہونے اور اپنے دین، ثقافت اور اقدار سے گہری وابستگی کے ذریعے نشاۃ الثانیہ کی راہ دکھائی۔اقبال کی حیات ہی میں ان کے خیالات کو عالمی سطح پذیرائی حاصل ہوئی۔ان کے پیش کردہ تصور کی بنیاد پر دنیا میں ایک نظریاتی مملکت کا قیام عمل میں آیا۔مصباح الحق صدیقی رقم طراز ہیں:

"اقبال نے پوری امتِ مسلمہ کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔وہ پوری دنیا کے اتحاد کے علمبردار تھے۔اس اتحاد کے لیے وہ کسی سیاسی دباؤ کے قائل نہیں تھے۔وہ یہ یگانگت صحیح قسم کے جذبہ اخوت اسلامی کے ساتھ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان کے اس اتحاد کی بنیاد اسلام کے نظریہ حریت فکر و اظہار رائے اور مساوات ہے۔"(۹)

علامہ کے افکار آفاقی قدروں کے حامل ہیں۔اقبال نے فلسفے کو شعر کی رعنائی میں ڈھالا اور علم وعمل اور حقائق کے بیان کو نغمہ وآہنگ کا پیکر عطا کیا۔وہ ایسے شاعر اور مفکر ہیں کہ جن کی شاعری اور افکار محض اپنے عہد تک ہی محدود نہ تھے۔اُن کی شاعری راہ عمل کا تعین اور حرکت کا پیغام دیتی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں ایسی صداقتوں

کو بیان کیا جن کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہتی ہے اور ہر دور میں برقرار رہے گی۔ڈاکٹر شاہد کامران نے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں فکر اقبال سے اجتہاد کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔بقول شاہد اقبال کامران:

''اقبال نے پوری توانائی کے ساتھ انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔۔۔۔۔اقبال کا فلسفہ تو یہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد کا حق ایک منتخب شدہ مجلس قانون ساز کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ایسی مجلس قانون ساز قرآن و سنت کی روشنی میں،اور جدید تقاضوں کے حوالے سے جو فیصلے کرے گی، وہ اجتماعی اجتہاد کہلائیں گے۔''(۱۰)

اہلِ علم و دانش کی جانب سے اقبال کی شاعری اور فلسفے کی طرف جس توجہ اور دلچسپی کا اظہار ہوا۔اس کا سلسلہ موجودہ عہد میں بھی جاری ہے۔اس کا اظہار شاعرِ مشرق کی شاعری اور فلسفے کے بارے میں شائع ہونے والے مقالات اور کتابوں کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔"تاریخ ادب اُردو میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔''وہ نوجوانان ہند کے بہترین شاعر ہیں کیونکہ انہی کے جذبات واحساسات کو وہ عمدہ طریقے سے ادا کرتے ہیں۔''(۱۱)

علامہ کی حیات،نظریات اور خدمات پر دنیا کی اہم زبانوں میں جو کام ہوا ہے وہ قابل تحسین ہے۔امریکہ،یورپ اور روس میں کلام اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں اس طرح دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں جیسے انگریزی، جرمنی،فرانسیسی، اطالوی، روسی، چینی، جاپانی،ترکی اور فارسی وغیرہ میں اقبال پر کتابیں اور مقالات قلمبند کیے جا چکے ہیں۔اقبال نے اگرچہ خطاب مسلمانوں سے کیا لیکن ان کا پیغام جغرافیائی حدود اور

مذہبی عقائد کی قیود سے آزاد ہے۔ان کے افکار میں ایسی عالمگیر خصوصیات ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر اقوام کے افراد اور غیر مسلم بھی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔مراکش کے پروفیسر ایس۔آئی۔فہد رقم طراز ہیں:

''اقبال ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔آپ کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیاز نسل و ملک سما جاتے ہیں۔آپ عظمت، انسانی کے علمبردار ہیں۔اسی لیے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے۔''(۱۲)

اقبال نے فلسفہء مغرب کا گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے سوچتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔اسی وجہ سے وہ بے حد مقبول ہے۔وہ مذہب کے بارے میں بہت پر جوش ہے۔وہ ایک حرم (مکہ) کی تعمیر میں مصروف ہے۔اس نئی بستی سے مراد ایک عالمگیر مذہبی مثالی ریاست ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان نسل و وطن کی قید سے بے نیاز ہو کر ایک ہو جائیں۔وہ استعماریت اور وطنیت کا مخالف ہے۔بقول آر۔اے۔نکلسن اقبال:

''جہاں منطق نا کام ہوتی ہے وہاں اس کی شاعری ذہن کو جلا بخشتی اور قائل کرتی ہے۔۔۔۔۔اقبال ایک پیغمبر کے روپ میں آتا ہے اور اپنے زمانے کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں سے بھی مخاطب ہوتا ہے۔من نوائے شاعر فرداستم''(۱۳)

علامہ محمد اقبال کی سوچ اور فکر کا مرکز ومحور قرآن تھا اور صاحبِ قرآن تھے۔وہ ایسے تصوف کے قائل تھے جو مردہ جسموں میں نئی روح پھونک دے۔اقبال کے فلسفے کی بنیاد قرآن مجید کی تعلیمات پر استوار ہے۔وہ متعصب مسلمان نہ تھے انہیں جہاں

سے بھی روشنی ملی انہوں نے اسے حاصل کرنے میں تامل نہ کیا۔وہ بیک وقت مسلمان صوفیانہ،مغربی فلاسفروں اور ہندو دانشوروں سے متاثر تھے،جس کے نتیجے میں ان کا کلام قلب روشن کا آئینہ بن گیا۔ایسا آئینہ کہ جس میں غیر مسلم اقوام بھی اپنے خدوخال کی شناخت کرسکتی ہیں۔ای۔ایم فاسٹر لکھتے ہیں:''اقبال کٹر مسلمان تو تھا مگر وہ کہنہ روایات کا پرستار نہ تھا۔۔۔۔اس کے خیالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں مگر وہ انتہا پسند اور متعصب نہ تھا۔''(۱۴)

اقبال نے تمام عمر انسانی عظمت کے گیت گائے ،یہ صرف جذباتی سطح پر ہی نہیں تھا بلکہ انہوں نے ان عوامل ومحرکات تک پہنچنے کی کوشش کی جو انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑتے ہیں۔اقبال ملک کے معاشی وسائل اور عوام کی اقتصادی صورت حال کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے۔چنانچہ انہوں نے اپنی اولین تالیف ''علم الاقتصاد ''میں ان اقتصادی امور کی نشاندہی کی جو اقوام اور افراد کو معاشی بدحالی کی دلال میں پھنسادیتے ہیں۔اس کے بعد انہوں نے ان مسائل کا فکری سطح پر مطالعہ کرکے جو نتائج اخذ کیے وہ عالمگیر اہمیت کے حامل ثابت ہوئے۔انہوں نے اپنے افکار کی ہمہ گیریت کی بناء پر عالمگیر مقبولیت حاصل کی۔ڈاکٹر یوسف حسین خان کہتے ہیں کہ''اقبال کو چونکہ اپنا پیغام عام لوگوں کو پہنچانا تھا اس لیے اس کے بیان میں وضاحت اور پھیلاو ہے۔اقبال کی نوائے گرم کی بلند آہنگی اس کی مقصدیت کی اندرونی لہر سے ہم آہنگ ہے۔''(۱۵)

اسی طرح لوس کلوڈ اپنے مضمون '' IQBAL:A GREAT HUMANIST''میں لکھتی ہیں کہ:

"Iqbal is one of the greatest figures in the

litrary history of the east.
He come at difficult moment to give courage and hope."(۱۶)

اقبال ایک ہمہ گیر شخصیت جن کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیاز نسل و ملک سماجاتے ہیں۔آپ عظمتِ انسانی کے علمبردار ہیں اس لیے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے علاوہ مغرب کے کئی ممالک میں اقبال شناسوں نے اقبال پر کئی حوالوں اور زوایوں سے کام کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مولوی احمد دین سے لے کر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور برصغیر پاک و ہند سے باہر مغرب میں نکلسن سے لے کر ڈاکٹر این میری شمل تک اقبال شناسی کی روایت پھیلی نظر آتی ہے۔صرف مرد حضرات کا ہی اقبال شناسی پر کام موجود نہیں بلکہ خواتین کا بھی اقبال پر کیا گیا کام قابلِ تعریف ہے۔

مختلف شہروں میں اقبالیاتی تحقیق پر مشتمل کتب کی اشاعت، اقبال شناسی کا ایک شاخسانہ ہے۔ اقبال اور لاہور، اقبال اور گجرات، اقبال اور لیہ، اقبال اور بھوپال، اقبال اور کشمیر، اقبال اور بلوچستان، اقبال اور افغانستان، اقبال اور سرگودھا، اقبال اور سیالکوٹ، اقبال اور ڈیرہ غازی خان، اقبال اور ہند، اسی طرح کی کئی کتب مختلف شہروں کے اقبالیاتی کام کو متعارف کروا رہی ہیں۔ پاکستان میں اقبال شناسوں کی ایک بڑی جماعت کام کر رہی ہے۔عصر حاضر میں لاتعداد احباب فکر اقبال کی ترویج و تفہیم کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بقول ہارون الرشید تبسم:

”ڈاکٹر علامہ محمد اقبال صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں سوچتے تھے بلکہ ان کی نظر عالمی افق پر رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں ہر دور اور ہر ملک

میں سراہا گیا۔''(۱۷)

دنیا کے بڑے بڑے فلسفی اقبال کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں۔مختلف مما لک میں برپا ہونے والی تجدید واحیائے دین کی تحاریک کے پس منظر میں اقبال کے افکار کی علمداری دکھائی دیتی ہے۔اقبال کا فلسفہ جو محض ایک لفظ پر مشتمل ہے پوری کائنات کو اپنے دائرہ کار میں سمیٹے ہوئے ہے۔اس ایک لفظ یعنی "خودی" کی لاکھوں اوراق پر مشتمل تشریحات ہو چکی ہیں اور مزید سے مزید وضاحتوں کا سلسلہ جاری ہے۔اسی ایک لفظی فلسفہ نے اقبال کو امامِ فلسفہ کی مسند پر بٹھایا۔اقبال کے افکار کی روشنی سے اندھیروں کو دور کرنے کا اہتمام کیا گیا۔اقبال کے انقلاب آفریں کی بدولت زمانہ ان کی جانب جلد متوجہ ہوا۔زاہد حسین انجم کے مطابق:

''اقبال کون ہیں؟ اقبال شاعر امروز، نابغہ روزگار، عالمی مفکر و مدبر، حکیم ملت، ترجمان حقیقت، دانائے راز، گنبد خضرا کے شیدائی، دینی علوم کے بحر بیکراں، تصور پاکستان کے خالق، مسلمانان برصغیر پاک و ہند کے غم خوار، رفعت خیال و قوت، بصیرت اور اعلیٰ ذوق عمل کے بہترین عکاس، قائد کے مدبر دوست۔۔۔اقبال کی شخصیت کی شناخت صرف یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کے کہیں بڑھ کر اقبال خودی کے پیامبر، محبت و یگانگت کے حسین پیکر، عقل وشعور کے مینارہ نور، ایک شفیق باپ، ایک باوفا شوہر، المختصر یہ کہ وہ سیرت و کردار کے بحر بے کراں ہیں۔''(۱۸)

پڑوسی ملک ایران میں تو اقبال شناسی کی قابل تقلید روایت ہے۔ان میں سید محمد محیط طباطبائی سعید غنی، ڈاکٹر غلام حسین یوسفی، ڈاکٹر جلال متینی، ڈاکٹر فریدوں بدرہ

ای، صادق سرمد، ڈاکٹر رضا زادہ شفیق، ڈاکٹر احمد علی رجائی، علی اکبر دہخدا، ادیب برومند، احمد گلچیں معانی، علی اصغر حکمت، کاظم رجوی ایزد، منوچہر طالقانی، قاسم رسا، امیر شفائی نوا، علی خدائی، ڈاکٹر علی نہاد تارلان، آیت اللہ سید علی خامنہ ای، حسین علی سلطان زادہ پسیان اور دیگر دانش ور شامل ہیں۔

بھارت میں اقبال شناسی کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد، اقبال سنگھ، ڈاکٹر سچد انند سنہا، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر ملک راج آنند، مالک رام، نربھے رام جوہر، سر جوگندر سنگھ، ڈاکٹر گیان چند، سردار گوربچن سنگھ، ہنس راج رتن، مہاراجہ سر کشن پرشاد، پروفیسر م۔ ت استیتاس، ڈاکٹر بوسانی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رابندر ناتھ ٹیگور، تلوک چند محروم، کلدیپ نیر، سر تیج بہادر سپرو، مجنوں گورکھپوری، عالم خوند میری، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر عشرت حسن انور، مولانا عبدالسلام ندوی، شمس الرحمٰن فاروقی، بلراج کومل، بلونت سنگھ لانبا، خشونت سنگھ اور کئی اقبال شناس مقبول ہیں۔ عالمی سطح کے مستشرقین میں پولولنسکایا، میر بٹا سٹے پین نیتیس، این میری شمل، سر ٹامس آرنلڈ، پروفیسر نکلسن، پروفیسر آربری اور اقبال، پروفیسر ڈکنسن، فاسٹر، ایوا ماریوچ، لوئی میسون، لوس کلوڈ میتیخ، ڈاکٹر شیلا میکڈونا، ڈاکٹر باربر امٹکاف، ڈاکٹر یاں ماریک، ہربرٹ ریڈ، سر مالکم ڈارلنگ، رش برک ولیمز اور لاتعداد اقبال شناسوں نے اپنے اپنے زوایہ نظر سے اقبال شناسی کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر شفیق عجمی رقم طراز ہیں:

”اقبال کے فکر کی تازگی، بلند آہنگی اور انقلابیت سے زمانہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ علمی دنیا میں اس کا خیر مقدم کیا گیا، اس کے فکر و شعر کی تفہیم و تشریح کے عمل کا آغاز ہوا، تراجم ہوئے، بحث و تنقید کا دروازہ کھلا، اتفاق و اختلاف، رد و قبول، اخذ و اکتساب کے

سلسلے بڑھتے چلے گئے اور ایک روایت کا آغاز ہوا، جو جلد ہی برعظیم کی جغرافیائی حدود کو پار کر کے چار دانگ عالم میں پھیلی، پروان چڑھی اور مستحکم ہوتی چلی گئی۔ آج اس روایت کو ''اقبال شناسی'' کا عنوان دیا جاتا ہے، جس میں مشرق و مغرب کے نامور محققین، شارحین اور ناقدین کی ایک بڑی تعداد نے اپنے انداز اور اسلوب میں بہت کچھ Contribute کیا ہے۔ جس سے اس روایت کو قوت، تحریک اور وسعت حاصل ہوئی ہے۔''(۱۹)

اقبال کے عالمگیر فلسفہ حیات کا یہ کاروانِ اقبال اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔اس بات کا ادراک تو دنیا بھر کے ناقدین کر رہے ہیں کہ وہ خودنمائی سے بالاتر تھے۔درویشی ان کے خمیر میں شامل تھی۔وہ برصغیر پاک وہند سے اُٹھےاور دنیا بھر کے علوم وفنون کواپنی لپیٹ میں لے لیا۔صبری تبریزی لکھتے ہیں:

''اقبال کا تخیل نہ تو مجرد تھا اور نہ محدود، یہ اس کے معاشرے کی جڑوں میں پیوست تھا، اس کی آرزو اور مقصد کا محرک یہ تھا کہ معاشرے کو تخلیق کیا جائے اور اس کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔''(۲۰)

مختلف مما لک میں بھی اقبال کے فکر وفن پر بہت سا کام ہو رہا ہے۔اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے پیش نظر کلام اقبال میں آفاقیت کا مسئلہ اپنے حل کے لیے نظریاتی بحث سے ہٹ کر اب عملی صداقت کا روپ دھار چکا ہے۔اقبال کے آفاقی کلام کو پڑھنے والوں نے مختلف زبانوں میں تراجم بھی کیے اور یوں اقبال کو مختلف زبانوں اور مختلف مما لک میں پڑھا اور سمجھا جانے لگا۔ڈاکٹر طٰہٰ حسین رقمطراز ہیں:

''اقبال کی سوچ بڑی منطقی بھی تھی، وہ اجتماعیت کا قائل تھا اور جماعت

کے لیے ہر ممکن حد تک مخلص۔ چنانچہ اس نے خود اپنی ساری زندگی عالم اسلام اور بنی نوع انسان کے لیے اس تعلیم وارشاد اور نصیحت و دعوت میں صرف کر دی کہ انسان خود اپنی نگاہ میں معتبر ہوتا کہ لوگوں کی نگاہ میں محترم ہو اور نتیجتاً زندگی کی نگاہ میں بھی وقیع ہو۔'' (۲۱)

آج اقبالیات کو ایک باقاعدہ شعبہ ء علم قرار دیا جا چکا ہے۔ پاکستان اور دیگر ممالک سے باہر بھی اقبال کی زندگی، ان کی شاعری اور فکر پر مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور تحقیق کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب تک ہونے والے کام پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ''اقبالیاتی ذخیرے'' کو دیکھ کر اطمینان بھی ہوتا ہے کہ اردو کے کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات پر اس درجہ ہونے والے کام کی مثال اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔ پاکستان کی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں کے علاوہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، بہار یونیورسٹی (بھارت)، ڈرہم یونیورسٹی (انگلستان)، تہران یونیورسٹی (ایران)، عین الشمس یونیورسٹی، قاہرہ (مصر)، چارلز یونیورسٹی، پراگ (چیکو سلواکیہ) میں اردو، انگریزی، فارسی، عربی اور چیک زبانوں میں پی ایچ ڈی کی سطح پر مقالات تحریر کیے گئے ہیں۔ جرمنی اور فرانسیسی زبان میں لکھے گئے مقالات کی تفاصیل بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ یہ ڈگریاں اردو اور فارسی شعبوں کے علاوہ عربی، فلسفہ اور سیاسیات کے شعبوں میں عطا کی گئیں۔ مختلف جامعات میں ایم۔اے کی سطح پر لکھے جانے والے مقالات بے شمار ہیں جبکہ ایم۔فل کی سطح پر بھی کام جاری ہے اور اقبالیات کے موضوع پر اب تک سینکڑوں مقالات قلمبند کیے جا چکے ہیں۔

پاکستان میں کئی نجی اشاعتی ادارے بھی اقبالیات کے حوالے سے قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اس کے علاوہ مختلف اداروں کی اقبال شناسی کی کتب بھی

منظر عام پر ہیں۔ وفاقی سطح پر قائم ''اقبال اکادمی پاکستان'' جس کا دفتر اور لائبریری ایوانِ اقبال، لاہور میں موجود ہے، اپنے انگریزی سہ ماہی مجلّات ''اقبالیات'' اور 'IQBAL REVIEW" اور دوسری علمی و ادبی سرگرمیوں کے ذریعے افکارِ اقبال کی ترویج و اشاعت میں اپنا فعال کردار ادا کر رہی ہے۔

اقبال اکادمی پاکستان اور بزم اقبال لاہور کے علاوہ بعض دوسرے سرکاری نیم سرکاری علمی اداروں نے بھی اقبال اور فکرِ اقبال کے حوالے سے اہم کتابیں شائع کیں ہیں۔ جیسے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے "Reconstruction of' religious Thoughat In Islam' بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اکادمی ادبیات، کی طرف سے سال 2002ء کے موقع پر ''اقبال کے سو سال'' کے عنوان سے منتخب مضامین کا مجموعہ شائع کیا گیا ہے اس کے علاوہ ادارہ فروغ اردو، مجلس ترقی ادب، انجمن ترقی اردو، نظریہ پاکستان ٹرسٹ، نظریہ پاکستان اکادمی، نیشنل بک فاونڈیشن پاکستان، ادارہ مقتدرہ قومی زبان، لوک ورثہ، ادارہ مطبوعات پاکستان، نظریہ پاکستان کونسل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، مجلس اقبال، دبستان اقبال، ایسے کئی اداروں نے اقبال شناسی کی روایت کو مستحکم کر رکھا ہے۔ شفیق عجمی لکھتے ہیں:

> ''پاکستان کی مختلف جامعات میں اقبالیات کے باقاعدہ شعبے قائم ہیں جبکہ 1974ء میں اسلام آباد میں فاصلاتی تعلیم کے لیے قائم ہونے والی یونیورسٹی کو اقبال کی ولادت کے جشن صد سالہ کی مناسبت سے 1977ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا نام دیا گیا جس میں دوسرے شعبوں کے علاوہ 1981ء سے شعبہء اقبالیات بھی افکارِ اقبال کے فروغ میں

نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔''(۲۲)

پاکستان میں علامہ اقبال یونیورسٹی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ جہاں اقبالیات کو ایک باقاعدہ مضمون کے طور پر اعلیٰ ثانوی سطح سے لے کر ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کی سطح تک وسعت دے دی گئی ہے اور متعدد سکالرز کو پی ایچ۔ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالات کی تکمیل پر ڈگریاں دی جا چکی ہیں اور کئی مقالات زیرِ تکمیل ہیں اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں اقبالیات کے حوالے سے خصوصی نمبر بھی قابلِ تعریف ہیں۔

پاکستان میں اقبال شناسی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔علامہ اقبال کے یوم وفات اور سالگرہ کے موقع پر بہترین تقریبات کا انعقاد اقبال شناسی کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔اقبال شناسی کی روایت کو بامِ عروج تک لے جانے میں رسائل و جرائد کا کردار بھی بہت اہم رہا ہے۔اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ادبی رسائل نے ہمیشہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی شیخ عبدالقادر نے لاہور میں "مخزن" کا اجراء کو جریدی صحافت میں ایک اہم موڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔یہی نہیں بلکہ لاہور کے ادبی پرچوں کے حوالے سے اردو ادب کی ایک نئی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ابتداء ہی سے "مخزن" کا کوئی پرچہ اقبال کے کلام سے خالی نہ ہوتا۔"بانگ درا" کی بیشتر نظمیں "مخزن" کی زینت بن چکی تھیں۔جنوری 1922ء میں لاہور سے "ہمایوں" میں بھی اقبال کا کلام چھپتا رہا۔علامہ کی شہرہ آفاق نظم "خضر راہ 1931" ء کے شمارے میں چھپی اور ساتھ میں اس کی رنگین عکاسی بھی کی گئی۔"نیرنگ خیال"،"ادبی دنیا"، "ادب لطیف"،"سویرا"، "نقوش"، اور "فنون" یہ محض چند جریدوں کے نہیں بلکہ ادبی میلانات کے دھاروں کے تال میل کی داستان کے درخشندہ ابواب ہیں۔جولائی

1924ء میں لاہور سے "نیرنگ خیال" کا اجراء ہوا۔ اس رسالہ نے ایک مخصوص نظریاتی نوعیت کا مواد لکھنے والا حلقہ پیدا کیا۔ جس میں علامہ اقبال سرفہرست تھے۔ نیرنگ خیال میں وقتاً فوقتاً اقبال کی مختلف تخلیقات شامل ہوتی رہیں۔ "ادبی دنیا" نے اقبال نمبر بھی شائع کیے۔ "ماہ نو" سید وقار عظیم کی ادارت میں 1947ء میں کراچی سے جاری ہوا۔ اس پرچے میں اقبال پر مضامین پیش کیے جاتے رہے جن میں "اقبال نمبر" قابل ذکر ہے۔ شورش کشمیری کا ہفت روزہ "چٹان" جنوری 1948ء میں جاری ہوا۔ گو اس کا اساسی موضوع سیاست ہے لیکن اس نے ادب کو سماج کے ایک موثر وسیلے کے طور پر قبول کیا۔ ہر سال اپریل میں "اقبال نمبر" کی اشاعت اس کی نمایاں خصوصیت تھی۔ شورش نے خود بھی اقبال کی تفہیم و تعبیر کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ جولائی 1948ء میں ہفت روزہ "قندیل" کا اجراء لاہور سے ہوا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''قندیل'' میں اقبالیات کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ہر سال اپریل میں اقبال کے یومِ وفات پر ایک پرچے میں ان پر چند صفحات ضرور مخصوص کیے جاتے اور ان کے شایانِ شان خراجِ تحسین پیش کیا جاتا'' (۲۳)

ماہر القادری کے ادبی، مذہبی اور سیاسی پرچے "فاران" میں بھی موضوعات اقبال کو زیادہ اہمیت دی جاتی۔ اسی طرح 1949ء کراچی سے شائع ہونے والے "قومی زبان" میں بھی وقفے وقفے سے اقبال پر مقالات و مضامین چھپتے رہے اور علامہ کی برسی پر خصوصی شمارہ شائع کیا جاتا۔ اپریل 1950ء میں لاہور سے "اقدام" کا اجراء ہوا۔ یہ پرچہ ہر سال اپریل میں اقبال نمبر شائع کرنے کا اہتمام

کرتا۔سہ ماہی مجلّہ "اقبال" لاہور سے 1952ء میں جاری ہوا۔اقبالیات کو اس دور میں ایک موضوع کی حیثیت حاصل تھی۔اسی طرح "اقبال ریویو" کا مقصد اقبال کی زندگی شاعری اور حکمت کے مطالعہ پر تجزیاتی تشریحی، تحلیلی اور عملی مضامین شائع کرنا تھا۔"سویرا" میں بھی موضوع اقبال پر مختلف مضامین اور مقالات چھپتے رہے۔"نقوش" لاہور سے موضوع اقبال پر وقفے وقفے سے تحقیقی وتنقیدی مقالات چھپتے رہے۔ہفت روزہ "لیل ونہار" کا اجراء لاہور سے 1951ء میں ہوا۔اس کے مدیران فیض احمد فیض اور سبط حسن تھے۔اس رسالہ میں بھی وقفے وقفے سے اقبالیات کو موضوع بحث بنایا گیا۔ماہنامہ "سیارہ" اگست 1962ء لاہور سے جاری ہوا۔سیارہ کا دوسرا اہم موضوع اقبالیات ہے۔جنوری 1966ء میں لاہور سے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں "اوراق" میں اقبالیات کے حوالے سے "جدید نظم نمبر(1977ء) اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔اس کی اشاعت میں بنیادی طور پر یہ نکتہ اُبھرا کہ جدید اردو نظم کو اقبال نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔سہ ماہی جریدے "غالب" کا آغاز جنوری 1975ء فیض احمد فیض کی ادارت میں ہوا۔اقبال کے جشن صد سالہ "اقبال نمبر" شائع کیا جو ایسے مضامین پر مشتمل تھا جو اپنے وقت کے معروف ومحترم رسائل میں شائع ہوئے تھے۔لیکن اب عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے۔اس ضمن میں آغا حیدر، حسن مرزا،سکندر علی وجد، مختار صدیقی اور پاشا رحمٰن کے مضامین کی اشاعت بھی کی گئی۔ستمبر 1977ء میں "اقبال نمبر" اس کا آخری شمارہ تھا۔صرف یہی رسائل نہیں جو فکر اقبال کو اجاگر کرنے میں پیش پیش رہے بلکہ اس کے علاوہ بے شمار رسائل اور دوسرے کالج یونیورسٹیوں کے میگزین بھی ہیں۔جنہوں نے موضوعات اقبال کو اپنایا اوران پرچوں کے اقبال نمبر تک چھپتے رہے مگر افسوس تمام رسائل کا احاطہ کرنا یہاں

ممکن نہیں ہے۔

مشرق و مغرب میں پھیلی ہوئی اقبال شناسی کی عالمی روایت ایک متحرک اور توانا تحریک کے طور پر اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے۔ گزشتہ اوراق میں اسی روایت کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا اور کوشش کی گئی ہے کہ تفہیم اقبال کے سلسلے میں کی جانے والی کاوشوں کا نہ صرف مجموعی جائزہ پیش کیا جائے بلکہ ان محرکات و رجحانات کا فہم بھی حاصل کیا جا سکے جو اس علمی روایت کے تسلسل کا باعث بنے اور اس ضمن میں ان اہم اقبال شناسوں کی عملی کارگزاریوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے جنھوں نے بطور مترجم، مفسر، محقق، شارح، ناقد اور ترجمان اقبال کی حیثیت سے اس روایت کو اعتبار بخشا اور اقبال کے فکر و شعر کے کسی نہ کسی پہلو کو روشن کیا، دوسروں کو بھی آگے بڑھنے، اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی ترغیب دی اور اپنا دیانتدرانہ علمی موقف پیش کرنے کا حوصلہ بخشا۔ اقبالیاتی ادب کا رقبہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے مطابق:

> ''اب تک اقبالیات کے نام سے جو ذخیرہ ادب تیار ہو چکا ہے وہ اس پایہ کا نہیں جیسا کہ ہونا چاہیے اور جس سے اقبال کے مطالعہ میں کافی مدد مل سکے اس کا سبب ظاہر ہے کہ اب تک کسی خاص منصوبہ بندی کے تحت یہ کام نہیں کیا گیا اور سوائے ان گنے چنے لوگوں کے جنھوں نے اپنے ذاتی شوق اور مطالعہ سے اقبال کی کسی نہ کسی حیثیت پر کام کیا، باقی اکثر تحریرات یا تو ایک دوسرے کی نقل ہیں یا محض مدحیہ اور ستائشی ہیں۔''(۲۴)

اقبال صدی نے اقبال شناسی کی جو تحریک پیدا کی تھی، اس کے اثرات باقی ہیں اور مختلف سطحوں پر مطالعہ اقبال جاری و ساری ہے۔ اس مطالعے میں دقت نظر اور

گہرائی پیدا کرنا اقبالیات کا بنیادی تقاضا ہے۔ جو اقبال شناسی میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔اُن کا آفاقی پیغام دنیا کی مختلف زبانوں میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جہاں اُردو بولی جاتی ہے وہاں اقبال کی تعریف وتوصیف کسی نہ کسی حوالے سے کی جاتی ہے۔دنیا کے کونے کونے میں اقبال شناس، افکارِ اقبال کی ترویج کے لیے اپنے اپنے دائرہ کار کے مطابق مصروف عمل ہیں۔ اقبال شناسوں نے تحقیقی و تنقیدی کتب، تحقیقی مقالات،رسائل و جرائد اوراخبارات میں اقبالیاتی تحریریں پیش کیں۔ اقبالیات میں اقبال شناسوں کے مقالات اور مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ان میں سے بیشتر مضامین مختلف کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔اقبال شناسوں نے اقبال شناسی کے فروغ کو اپنی زندگی کا مشن سمجھا اور اس بلند پایہ شاعر اور فلسفی کو نہ صرف اپنی شاعری کے توسط سے خراج عقیدت پیش کیا بلکہ دلکش نثر کے ذریعے اقبال کی شخصیت،شاعری،فلسفہ اور پیغام کوعوام تک پہنچایا۔

حمیرا جمیل

سکالر ایم ایس اردو جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

ڈاکٹر طاہر عباس طیب

اسسٹنٹ پروفیسر اردو جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

گفتنی

علامہ اقبال کا شمار صفِ اول کے ان شاعروں، فلسفیوں، مفکروں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جو اپنی حیات میں ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے اور ان کی آواز مشرق و مغرب کے ساز پر نغمے بکھیرنے لگی تھی۔ اقبال نے ہمت و جرات، عمل و سعی پیہم، خود اعتمادی سب سے بڑھ کر ایمان باللہ اور خدمتِ اسلام کی بھی دعوت دی، ایک طرف شاعر کی مثال پسندی، اور دوسری طرف ایک ایسے آدمی کی حقیقت پسندی جو اپنی گردو پیش کی چیزوں کو عملی نقطہ نظر سے دیکھنے کی عادی ہو، اقبال کو اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر غیر متزلزل یقین تھا۔ اس کے نزدیک ایک فرد کی زندگی میں کامیابی کے معنی یہ تھے کہ اس کی ذات کی تکمیل ہو جائے، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی راستہ تھا، اور وہ تھا تعلیمات اسلامی کی پیروی، اقبال نے انسانیت کو بھی پیہم عمل اور تکمیل ذات کے ذریعے اپنی فلاح حاصل کرنے کی دعوت دی۔

علامہ اقبال پر ہزاروں کتابیں اور ہزاروں مقالے لکھے گئے ہیں۔ بلحاظ مقدار یہ ذخیرہ جتنا بھی ہے لیکن معیار و افادیت کے لحاظ سے بہت کم حصہ ایسا ہے جس کو اقبال شناسی کا نام دیا جا سکے۔ پیش نظر کتاب میں اقبال کی زندگی اور قیام لاہور کے

دوران کے سارے سیاسی و معاشرتی مسائل اور اُن میں علامہ کے کردار کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لے کر علامہ اقبال کے قیام لاہور کا حقیقی تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب صرف میری کوششوں کا نتیجہ نہیں اس میں ماہر اقبالیات ڈاکٹر منور ہاشمی نے کتاب کی ترتیب و تدوین اور دیگر مراحل میں جس طرح تعاون کیا قابل ستائش اور حیات افزا ہے۔ اقبال اکادمی، لاہور میں موجود ارشد صاحب اور ادارے میں کام کرنے والی تمام انتظامیہ کی شکر گزر ہوں۔ اقبال سٹمپ سوسائٹی، لاہور کے سرپرست میاں ساجد علی نے اپنی مصروفیات سے مجھے بیش بہا وقت دیا اور میری راہنمائی کے ساتھ ساتھ مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔ قابل احترام استاد ڈاکٹر محمد افضال بٹ اور ڈاکٹر طاہر عباس طیب کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ دعا پبلی کیشنز، لاہو کے سربراہ زاہد شیخ صاحب کی بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے مقدور بھر تعاون کیا۔ آخر میں اپنے محترم والدین خصوصاً والد محترم کا شکریہ تو شاید میں کسی طور بھی ادا نہ کرسکوں کیونکہ ان کی دعاؤں، محبتوں اور شفقتوں کے سامنے الفاظ عاجز اور ہیچ ہیں۔

حمیرا جمیل

ایم ایس سکالر

۳ فروری ۲۰۲۰ء

لاہور کا تاریخی وادبی پس منظر

لاہور شہر کا شمار دنیا کے مشہور،قدیم اور خوبصورت تاریخی شہروں میں ہوتا ہے۔روایات کے مطابق تو یہ شہر قبل از مسیح دور کا ہے۔ہندوؤں کی مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ لاہور شہر رام کے بیٹے لوہ نے آباد کیا تھا لیکن تاریخ لاہور کا ذکر پہلی مرتبہ ۹۸۲ء میں شائع ہونے والی کتاب ''حدودالعالم'' میں ملتا ہے۔شاہ حسین میراں زنجانی اپنے دو بھائیوں کے ہمراہ اسی دور میں لاہور تشریف لائے۔ان کی آمد کے کچھ عرصہ بعد محمود غزنوی نے ہندو راجہ جے پال کو شکست دے کر لاہور میں پختہ قلعہ تعمیر کیا۔اس کے بعد لاہور کی تاریخ کا اہم سنگ میل شیر شاہ سوری کا لاہور جی ٹی روڈ کو تعمیر کرنا تھا۔اس سڑک کی تعمیر سے لاہور شہر نہ صرف برصغیر کے اہم شہروں سے منسلک ہوگیا بلکہ اس کی تکمیل کے بعد لاہور شہر کی اہمیت،شہرت اور وسعت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ہم لاہور شہر کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو بڑی عجیب وغریب صورت حال سامنے آتی ہے۔کسی دور میں تو لاہور کا شمار دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں ہوا اور کسی دور میں یہ شہر لوٹ مار کا شکار اور تباہی و بربادی کی تصویر نظر آیا۔جب تاتاریوں نے لاہور شہر کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا تو مغلوں نے یہ شہر دوبارہ تعمیر کر کے اسے دنیا

کے خوبصورت اور ترقی یافتہ شہروں میں شامل کر دیا۔شہر کے گرد فصیل تعمیر کر دی گئی اور اس میں داخلے کے لیے ۱۲ دروازے تعمیر کیے گئے۔فصیل کے باہر دریا بہتا تھا اور دریا کے ساتھ خوبصورت باغ بنایا گیا۔مغلیہ دور میں تعمیر کی گئی بادشاہی مسجد،قلعہ لاہور،شالامار باغ،جہانگیر کا مقبرہ اور مسجد وزیر خان جیسی لازوال عمارتیں آج بھی لاہور شہر کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔سکھوں کے دور میں پھر اس شہر پر قیامت ٹوٹی۔صدیوں سے مقیم خاص طور پر مسلمان امرا اور شرفا کی ایک بڑی تعداد شہر چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور ہوئی اور شہر کی بہت سی خوبصورت تاریخی عمارتیں،مزارات اور مساجد لوٹ مار سے محفوظ نہ رہ سکیں۔۱۷۵۰ء سے ۱۸۵۰ء تک کی طویل سیاہ صدی کے خاتمہ پر جب انگریز نے پنجاب کی حکمرانی سنبھالی تو لاہور کی ترقی کا ایک نیا باب کھلا۔انگریز نے لاہور میں بے شمار جدید عمارتوں کی تعمیر شروع کر دی۔ریلوے سٹیشن،پنجاب یونیورسٹی،ٹاؤن ہال،ضلع کچہری،گورنمنٹ کالج،عجائب گھر،ہائی کورٹ،جی پی او،منٹگمری ہال،ایچی سن کالج،کنیرڈ کالج،میو ہسپتال،میو سکول آف آرٹس،ٹولنٹن مارکیٹ،اسمبلی ہال اور دوسری بے شمار عمارتیں تعمیر کیں۔ان تمام عمارتوں میں برطانوی،مغلیہ اور اسلامی کلچر کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔۱۸۶۰ء سے ۱۹۱۵ء تک ۵۵ سال کا عرصہ اہل لاہور کے لیے امن،ترقی اور خوش حالی کا دور ثابت ہوا۔انگریز کے اس دور میں فصیل کے باہر ایک جدید،حسین اور نیا لاہور ابھر کے سامنے آیا۔بلاشبہ یہ دور لاہور کی ترقی وعروج کا تھا۔اس تعلیمی دور کا اعجاز ہے کہ سرسید احمد خاں،قائداعظم،علامہ اقبال،مولانا محمد علی جوہر،مولانا ظفر علی اور مولانا مودودی وغیرہ جیسی قد آور شخصیات پیدا ہوئیں۔اس دور میں پنجاب یونیورسٹی اور لاہور سے

تعلق رکھنے والے افراد کو نوبل پرائز سے نوازا گیا۔لیکن آزادی کے بعد قحط الرجال ہے۔پاکستان بننے کے بعد لاہور شہر ترقی کی دوڑ میں دنیا کے کئی قدیم اور جدید شہروں سے پیچھے رہ گیا ہے۔دبئی، بنکاک اور کوالالمپور جو ۱۹۴۷ء میں لاہور کی نسبت بہت پسماندہ تھے آج انتہائی ترقی یافتہ شہر ہیں۔

زندہ دلان لاہور اس شہر نگاراں، شہر خوباں اور شہر بہاراں سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ وہ ساری دنیا گھوم پھر آئیں، پیرس اور لندن کی گلیاں دیکھ لیں اور وہ دوسرے ملکوں اور شہروں کی خوبصورتی سے متاثر بھی ہوں، لیکن واپسی پر بھی کہیں گے کہ مشرق ہو یا مغرب، لاہور لاہور ہے۔آخر کیوں نہ ہو؟ لاہور واقعی لاہور ہے۔اس کے ذرے ذرے میں ایک جہاں آباد ہے۔لاہور سے لاہور تک کی دنیا ہی نرالی ہے۔تاریخ میں اس کا ذکر آج نہیں صدیوں سے ہے۔مورخین و مولفین اس شہر کی تاریخ پر بجا طور پر ناز کرتے رہے ہیں۔

لاہور کے دینی مدارس اور علمائے قدیم

دارا شکوہ گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں سکونت پذیر ہوا۔لاہور کا ذکر کرتے ہوئے دارا شکوہ نے اپنی تصنیف سکینتہ الاولیاء میں لکھا۔

> ”لاہور ایک نہایت معزز اور ممتاز شہر ہے۔اس جیسا دوسرا کوئی اور شہر روئے زمین پر نہیں ہے۔آج یہ شہر اولیائے صالحین اور علماء کا مرکز ہے۔ یہاں بہت سے مشائخ اور اولیائے اللہ کے مزار ہیں۔ایک روایت کے مطابق عہد جہانگیری میں مرد و زن، صغیر و کبیر، تین ہزار حفاظ تھے۔اب

بھی اس شہر میں حفاظ کی ان گنت تعداد موجود ہے۔''

یہ اقتباس لاہور کی نامور علمی، ادبی و تاریخی شخصیت اور ممتاز علم الدین سالک نے اپنے شہرہ آفاق تحقیقی مقالے میں درج کیا ہے۔ یہ تحقیقی اور تاریخی مقالہ آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوا۔فیض عام کے لیے میں اس مقالے سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن میں لاہور کے چند ایک دینی مدرسوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مدرسہ دائی لاڈو

دائی لاڈو شاہ جہاں کی دایہ تھی۔ بہت مالدار اور پرہیزگار خاتون تھی۔وہ شیخ سلیم چشتی کی مرید تھی اور حج کی سعادت بھی حاصل کر چکی تھی۔اس کے محلات لاہور کے محلّہ زین خاں میں تھے۔ یہ محلّہ کبھی گزر تلہ بھی کہلاتا تھا۔شاہ جہاں کے زمانے میں دائی لاڈو کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں پہلے رتن باغ تھا۔اب یہاں ہسپتال بن گیا ہے۔ جہاں بھارت بلڈنگ والی مارکیٹ نسبت روڈ اور گاندھی پارک واقع ہیں۔ یہ محلّہ اسی جگہ پر ہوا کرتا تھا۔دائی لاڈو نے ۱۰۴۱ھ بمطابق ۱۹۳۱ء میں یہاں ایک مسجد تعمیر کروائی جو اب تک موجود ہے۔مسجد میں دائی لاڈو اور اس کے خاوند کی قبریں بھی ہیں۔

دائی لاڈو نے مسجد کے ساتھ ایک دینی مدرسہ بھی تعمیر کروایا اور اپنی جائیداد کا بہت سا حصہ اس مسجد اور مدرسے کے اخراجات کے لیے وقف کر دیا۔اس مدرسے کے پہلے شیخ مولانا عصمت اللہ تھے۔مولانا کی شہرت دور دور تک تھی۔ وہ بے حد پرہیزگار اور متقی تھے۔

معقولات ومنقولات میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔مولانا کی کشش ہر طرف سے طلبہ کو وہاں کھینچ لائی اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ مدرسہ دینی مرکز بن گیا۔دائی لاڈو کے فوت ہونے سے دس ماہ قبل اس کا خاوند بھی فوت ہو چکا تھا۔ان کے فرزند محمد مشکور نے اس دینی مدرسے کو بدستور چلایا۔چونکہ وہ لاولد تھا۔اس نے اپنی تمام جائیداد مدرسے کے نام وقف کر دی۔ یہ مدرسہ نواب زکریا خان کے زمانے تک قائم تھا۔جب سکھ لاہور پر قابض ہوئے تو انہوں نے دیگر علمی اداروں کے ساتھ اس مدرسے کو بھی تباہ کر دیا۔مدرسے کی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئیں۔

درس میاں وڈا یا مدرسہ تیل واڑہ

اس مدرسے کے بانی مولانا محمد اسماعیل سہروردی تھے۔آپ کا آبائی پیشہ زمینداری تھا۔آپ کی ولادت ۱۸۸۶ء میں علاقہ پوٹھوہار میں ہوئی۔ابتداء میں آپ شیخ عبدالکریم سہروردی کے شاگرد ہوئے۔آپ کی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنی کتاب میں یوں بیان کیا ہے۔کہتے ہیں کہ جب آپ دینی علوم کی تحصیل میں ہمہ تن مصروف تھے تو آپ کی عمر بارہ برس تھی۔مولانا عبدالکریم کے درس کے ساتھ لنگر خانہ بھی تھا جہاں سے طلبہ کو کھانا ملتا تھا۔میاں محمد اسماعیل کے سپرد لنگر کے لیے آٹا پیسنا تھا۔وہ مدتوں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔یہ چکی ان کے حجرے میں ہوتی تھی۔اور وہ وقت مقررہ پر آٹا لنگر پہنچا دیتے تھے ایک دن ایسا ہوا کہ آٹا وقت پر نہ پہنچا۔آپ کے ساتھیوں نے کچھ دیر انتظار کیا۔پھر وہ پریشان ہوئے کہ کہیں میاں محمد اسماعیل بیمار نہ ہو گئے ہوں۔آپ کا ایک اہم سبق حجرے کی طرف آیا اور اندر داخل ہوا۔کیا دیکھتا ہے کہ میاں محمد اسماعیل تو مراقبے میں ہیں اور چکی خود بخود

چل رہی ہے۔اور آٹا پس رہا ہے۔وہ دبے پاؤں واپس استاد کے پاس گیااوار سارا واقعہ بیان کیا۔شیخ عبدالکریم سہر وردی خود وہاں پہنچے۔جیسا سنا تھا ویسا ہی دیکھا۔واپس لوٹ آئے اور دل میں شاگرد کی کیفیت پر خوش بھی ہوئے۔ادھر کچھ دیر بعد میاں اسماعیل کو ہوش آیا۔آٹا لے کر لنگر خانے پہنچے۔استاد سے تاخیر کی معافی مانگی۔استاد نے کہا۔

''اے نور نظر! آج سے تم یہ تکلیف نہ کرنا۔تمہارے مشاغل میں ہرج ہوتا ہے۔''

میاں اسماعیل استاد کا یہ حکم سن کر ڈر گئے اور اس کا سبب دریافت کیا۔استاد نے کہا۔''تمہیں تکلیف دینے سے ملائکہ کو تکلیف ہوتی ہے۔تمہاری یہ خدمت مقرر کی جاتی ہے کہ دن بھر مطالعہ میں مشغول رہا کرو۔''

کچھ عرصہ بعد مخدوم عبدالکریم کے پڑوسیوں نے میاں اسماعیل کو صالح اور متقی دیکھ کر یہ خواہش کی کہ ہماری بھینسوں کا دودھ بھی تم ہی دوہ دیا کرو۔آپ نے وعدہ کیا اور استاد کی خدمت کے ساتھ مخلوق خدا کی خدمت بھی شروع کر دی۔آپ کی عادت تھی کے دودھ کے تمام برتن ایک جگہ جمع کر کے سر کے اوپر اٹھا لیتے اور پھر گاؤں کا رخ کرتے۔ایک دن ایسا ہوا کہ استاد مخدوم عبدالکریم اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔کیا دیکھتے ہیں کہ میاں اسمٰعیل کے سر پر جو برتن رکھے ہوئے ہیں وہ سر سے ذرا اونچے ہیں اور آپ پر استغراق کا عالم طاری ہے۔قدم اپنے آپ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔اس پر استاد کو یقین ہو گیا کہ آپ ولایت کے درجے تک پہنچ چکے ہیں۔اب ان کے مزید وہاں قیام کی ضرورت نہیں۔چنانچہ استاد نے انہیں طلب فرمایا اور کہا:

”مدرسہ کی پابندی سے آپ کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا۔آپ کسی دوسرے مقام کی طرف تشریف لے جائیں اور خلق خدا کی خدمت کریں۔وقت آ گیا ہے کہ آپ خلق خدا کی فلاح و بہبود اور رشد و ہدایت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔“

ایک دن میاں اسماعیل ریاضت میں مشغول تھے کہ غیب سے اشارہ ہوا کہ آپ لاہور جائیں۔اس وقت آپ کی عمر پینتالیس سال تھی۔لاہور پہنچ کر آپ نے محلّہ تیل واڑہ میں قیام کیا۔یہ محلّہ اسی جگہ تھا جہاں آپ کا درس اور مسجد واقع ہے۔آپ نے وہاں درس و تدریس اور تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع کیا۔اس نیک کام کو شروع کرنے سے پیشتر آپ نے حضرت شیخ علی ہجویری عرف حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر چلہ کشی کی۔محلّہ تیل واڑہ کے ساتھ ہی ایک محلّہ آباد تھا جسے محلّہ گنج پورہ کہتے ہیں۔وہاں ایک قدیم مسجد تھی۔آپ نے اس مسجد کو از سر نو تعمیر کروایا اور اس مسجد میں درس کی ابتداء کی۔میاں محمد اسماعیل قرآن پاک،حدیث،فقہ،تفسیر اور علوم دینیہ کا درس دیا کرتے تھے۔آپ ۱۶۷۶ء میں بمقام لاہور ہی فوت ہوئے۔آپ کا مزار درس کے احاطے میں ہے اور آپ کی وصیت کے مطابق کچا ہے۔آپ کی وفات کے بعد محمد صالح پچیس برس تک اس مدرسے کے مہتمم رہے۔جب سلطنت اسلامیہ کو زوال آیا تو دوسرے اداروں کے ساتھ اس مدرسے کو بھی نقصان پہنچا۔

مدرسہ میانی صاحب

اسی زمانے میں لاہور کے مغربی حصے میں ایک دینی مدرسہ بڑے اہتمام سے خدمت دین کر رہا تھا۔اس مدرسے کے بانی شیخ محمد طاہرؒ تھے جو سلسلہ قادریہ نقشبندیہ

سے تعلق رکھتے تھے۔شیخ محمد طاہرؒ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مریدوں میں سے تھے۔آپ سرہند شریف میں مرشد زادوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔کچھ عرصہ بعد آپ کو حکم ہوا کہ آپ لاہور تشریف لے جائیں۔اور وہاں درس و تدریس کا کام شروع کردیں۔چنانچہ آپ اپنے پیر کے حکم سے لاہور تشریف لے جائیں۔یہاں آپ نے تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری کردیا۔آپ کے درس میں ہزار ہا لوگ شامل ہوتے اور اعلیٰ مراتب پر پہنچتے۔آپ تمام عمر کسی امیر کے پاس نہیں گئے اور نہ ان کو اپنے قریب آنے دیا۔آپ کسب حلال سے روزی کماتے اور احادیث و تفاسیر کی کتابوں کی کتابت کرکے بسر اوقات کرتے۔پھر رات رات بھر یادالٰہی میں مشغول رہتے۔کوئی سائل آپ کے در سے خالی نہ جاتا۔آپ کی وفات جمعرات ۸ محرم ۱۰۴۰ھ بہ مطابق ۱۶۳۰ء کو ہوئی اور اپنے مدرسے کے ایک گوشے میں دفن ہوئے۔

آپ کے بعد مولانا ابو محمد قادری اس مدرسے کے مہتمم مقرر ہوئے۔آہستہ آہستہ اس مدرسے کے گرد ایک زبردست محلّہ آباد ہوگیا۔جو محلّہ میانی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ان ایام میں ''میاں'' پڑھے لکھے اور فاضل آدمیوں کو کہتے تھے۔چونکہ اس محلے میں لاہور کے بڑے بڑے عالم فاضل لوگ رہتے تھے اس لیے یہ محلّہ میانی کے نام سے پکارا جانے لگا۔سیالکوٹ میں میانہ پورہ اس محلے کا نام ہے جس میں علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی رہا کرتے تھے۔محلّہ میانی کے مدرسے کے ساتھ ایک زبردست کتب خانہ بھی تھا جو سلطنت اسلامیہ کے زوال تک قائم رہا۔رائے بہادر کنہیا لعل تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں۔

''سکھوں نے اس محلے کو لوٹتے وقت اس بیش بہا کتب خانے کو بھی آگ

لگادی۔اس طرح ہزار ہانادر کتابیں جل کر راکھ ہوگئیں۔“

آج کل یہ سارا علاقہ قبرستان کے طور پر استعمال ہورہا ہے۔غالباً اس سے بڑا قبرستان اور کہیں نہیں ملے گا۔اسی کے وسط میں شیخ محمد طاہر بندگیؒ کا مزار ہے۔مزار کے گرداگرد ایک چاردیواری تھی جواب گرچکی ہے۔مزار ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔اس کے مشرق کی طرف مولانا ابومحمد قادری اور سید خیر شاہ کی قبریں ہیں۔مغرب کی جانب ایک قدیم مسجد ہے۔

مدرسہ خیر گڑھ جس مقام پر آج کل گڑھی شاہو آباد ہے۔اس جگہ کو اکبر کے زمانے میں شیخو گڑھی کہتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اکبر نے یہ مختصر سی بستی اپنے بیٹے شہزاد سلیم کے نام بسائی تھی۔جسے وہ شیخ سلیم چشتی کے احترام کی وجہ سے شیخو بابا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔شاہ جہاں کے عہد میں بغداد سے ایک نہایت فاضل اور جید عالم مولانا ابو الخیر لاہور میں وارد ہوئے۔ان کی شہرت تھوڑے ہی عرصے میں دور دور تک پھیل گئی اور گھر گھر ان کے علم و فضل کے چرچے ہونے لگے۔چنانچہ حکومت کے ایماء پر انہوں نے درس و تدریس کے لیے ایک مدرسہ شیخو کی گڑھی میں جاری کیا۔آپ نے مدرسے کے لیے ایک عالی شان عمارت تعمیر کی جس کے ساتھ ایک وسیع مسجد بھی تھی۔طلبہ کے قیام کے لیے حجرے تھے۔اس عالی شان مدرسے کی فصیل اور دیواریں قلعہ نما تھیں۔مدرسے کا تمام خرچ لاہور کے شاہی خزانے سے ادا ہوتا تھا۔مولانا ابوالخیر نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔آپ کی وفات کے بعد اس مدرسے کا انتظام آپ کے خلیفہ مولانا محمد نعیم کے ہاتھ آیا۔انہوں نے اس فیض کو برابر جاری رکھا۔سکھوں کی غارت گری کے زمانے میں اس مدرسے کو بھی نقصان پہنچا اور لاہور کے دوسرے علاقوں کی طرح

یہ علاقہ بھی ویران ہوگیا۔ کچھ مدت تک یہ علاقہ کسمپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔ مولوی نور احمد چشتی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ۱۷۵۷ء میں ماجھے کا ایک تیلی شاہو نام یہاں وارد ہوا۔ وہ دن کے وقت بکریاں چراتا اور رات کے وقت ڈاکے مارتا۔ خدا کی شان ہے کہ یہ علاقہ جو شیخو گڑھی سے خیر گڑھ بنا تھا اب اسی کے نام پر گڑھی شاہو کہلاتا ہے۔ واللہ عالم بالثواب۔ مولانا ابوالخیر کا مزار گڑھی کی چار دیواری میں چند اور قبروں کے ساتھ بلند چبوترے پر واقع ہے۔

مدرسہ ابوالحسن خاں تربتی

یہ لاہور کا مدرسہ تھا اور سب سے خوبصورت اور امیر گزر مغلپورہ میں واقع تھا۔ نواب ابوالحسن خان عہد جہانگیری کا ایک کبیر تھا اور وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔ اس کا لڑکا ظفر خان احسن کشمیر کا گورنر تھا۔ اس نے کئی حویلیاں، محل، باغ اور دیگر عمارتیں بنوائیں۔ نواب مرحوم کی بیگم مخدومہ جہاں کہلاتی تھیں۔ وہ اسلامی علوم و فنون میں بڑا درک رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے خاوند کی یاد میں مدرسہ جاری کیا اور ایک ہزار حافظ مقرر کیے جو وہاں باری باری قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے۔ مدرسہ کے معلمین میں سب سے نمایاں نام شیخ حامد قادری کا ہے۔ جو ایک مدت تک اس مدرسے کے مہتمم رہے۔ مولانا حامد قادری نہایت فصیح البیان واعظ اور فاضل اجل تھے۔ دور دور سے لوگ آپ کے ہاں استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ آپ ۱۷۵۲ء میں فوت ہوئے اور مدرسے کے ایک کونے میں دفن کیے گئے۔ آپ کی وفات کے بعد رحمت اللہ اس مدرسے کے منتظم مقرر ہوئے۔ مگر وہ زمانہ بدامنی کا تھا۔ سکھوں نے ہر جگہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہ مدرسہ بھی ویران ہوگیا۔ اس

وقت یہ جگہ ریلوے اسٹیشن کی چاردیواری میں آچکی ہے۔

مدرسہ ملا فاضل قادری

یہ مدرسہ اس جگہ تھا جہاں آج کل جیل روڈ اور وارث روڈ ملتی ہے۔مُلا فاضل قادری ایک نیک دل بزرگ تھے۔حکومت انہیں مدد معاش دیتی تھی جسے وہ مدرسے پر صرف کرتے تھے۔آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگرد شاہ شرف نے اس کام کو جاری رکھا۔استاد اور شاگرد دونوں کی قبریں ابھی تک مدرسے کے محل وقوع کا پتا دیتی ہیں۔

مدرسہ ملاّ خواجہ بہاری

یہ مدرسہ دہلی دروازے کے اندر واقع تھا۔نواب سعد اللہ خان اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ملا خواجہ بہاری کا اصل وطن حاجی پور تھا جو بہار میں واقع ہے۔آپ چھوٹی عمر میں ہی علم کی تلاش میں وطن سے نکلے۔کچھ مدت تک قصبہ کورا میں شیخ جمال اولیاء کی خدمت میں رہے۔وہاں سے فیضان حاصل کر کے لاہور تشریف لے آئے اور ملا فاضل لاہور سے ظاہری علوم کی تحصیل میں مصروف ہو گئے۔ملا فاضل اپنے ہونہار شاگرد سے بہت خوش تھے اور انہیں اپنے گھر میں رکھتے تھے۔ان ایام میں حضرت شیخ میاں میر صاحبؒ کا باطنی فیض عام تھا۔آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔بیعت کی اور ان کی توجہ سے باطنی علوم میں کامل ہو گئے۔ملا خواجہ بہاری عالم علوم فقہ وحدیث وتفسیر تھے۔تذکرہ علمائے ہند کا منصف لکھتا ہے:

''مُلا بہاری فقہیہ محدث، مفسر و واقف اسرار حقانی بود۔''

حضرت میاں میر صاحبؒ کی وفات کے بعد مُلا خواجہ بہاری کو قبولیت عام حاصل ہوئی۔آپ کی بے نیازی کی یہ حالت تھی کہ شاہ جہاں ایک مرتبہ آپ کی ملاقات کے لیے آیا تو آپ یہ خبر سن کر وہاں سے چل دیئے۔جب اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں طمانیت قلب کھونا نہیں چاہتا۔ایک فقیر کو بادشاہوں کی ملاقات سے کیا سروکار۔

داراشکوہ لکھتا ہے کہ ایک دن آپ شالامار کی سیر کو گئے وہاں دو تین مرتبہ آپ نے فرمایا۔ مجھے طلب نہیں کرتے۔اگر وہ طلب کریں تو مجھے مرشد کی قبر کے پاس دفن کرنا۔آپ نے ۱۶۴۹ء میں انتقال فرمایا۔

شیخ عبدالکریم چشتی لاہوری

مخدوم الملک عبداللہ انصاری کے صاحبزادے تھے۔آپ بھی شیخ نظام الدین ملنجی کے مرید تھے۔جب اکبر نے مخدوم الملک کو حج پر روانہ کیا تو آپ بھی اپنے والد کے ہمراہ تھے،اس کے بعد آپ لاہور تشریف لے آئے اور لوگوں کو ہدایت اور تلقین شروع کردی۔آپ کی خانقاہ اور مدرسہ نواں کوٹ میں افضل خان علاّمی کے باغ کے قریب تھا۔آپ عالم فاضل اور فاضل کامل تھے۔آپ کی مشہور تصنیف فصوص الحکم خاص و عام میں آج بھی ہر دلعزیز اور مشہور ہے۔آپ ۱۶۳۵ء میں فوت ہوئے اور آپ کا مزار آج بھی نواں کوٹ میں واقع ہے۔

مدرسہ وزیر خان

یہ مدرسہ لاہور کا بڑا مشہور مدرسہ تھا۔اس کا بانی حکیم علیم الدین انصاری تھا۔اس

نے اپنی مسجد ۱۶۳۴ء میں تعمیر کرنا شروع کی۔نواب وزیر خاں نے بہت سی جائیداداور املاک اس مدرسے اور مسجد کے اخراجات کے لیے وقف کی۔ایک وصیت کی رُو سے مسجد اور مدرسے کے بانی نے مسجد کے اندرونی دروازے کی دکانیں جلد سازوں،صحافوں وغیرہ کے استعمال کے لیے وقف کی ہیں اور حجروں میں طالب علم،جدول ساز،کاتب وغیرہ رہ سکتے ہیں۔مولوی نوراحمد چشتی کا بیان ہے کہ میں نے اس کا صحیح مصرف اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔جج محمد لطیف کا بیان ہے کہ مسجد کے نام بہت بڑی جائیداد تھی جو دہلی دروازے سے لے کر پرانی کوتوالی کے چوک تک پھیلی ہوئی تھی۔

امام گاموں

آپ مولانا محمد صدیق لاہوری کے خلف الرشید تھے۔قرآن پاک کے حافظ اور رائج الوقت علوم وفنون کے ماہر تھے۔آپ بھی مسجد وزیر خان کے امام تھے۔رنجیت سنگھ آپ کا دل سے احترام کرتا تھا۔آپ بڑے نیک دل، نیک طینت اور نیک خیال بزرگ تھے۔اہل اللہ کے دل دادہ اور درویشوں کے خدمت گزار تھے۔زہدوتقویٰ کی بناپر آپ قرآن پاک کی کتابت کرتے،اس سے جو میسر آتا اس میں سے کچھ حصہ اپنے اوپر صرف کرتے اور کچھ اہل علم اور درویشوں میں تقسیم کردیتے۔آپ اپنے درس کے طالب علموں کا بڑا خیال رکھتے۔ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔آپ نے کئی کتابیں لکھیں جس میں ''شمس التوحید'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔یہ فارسی نثر میں ہے۔آپ کا انتقال ۱۸۲۷ء میں ہوا۔آپ کا مقبرہ مسجدوزیر خاں کے احاطے کے باہر جنوب کی جانب ایک بلند گنبد کے نیچے ہے۔

مُلا یعقوب لاہوری

آپ لاہور کی منفرد شخصیت اور عمل صالح کے مصنف مُلّا محمد صالح کے ہم عصر تھے۔آپ مختلف علوم و فنون میں باکمال تھے۔فقہ،اصول فقہ،حدیث شریف،تفسیر،منطق،معانی اور کلام میں آپ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔اخلاق اور دیگر اوصاف انسانی میں آپ بے نظیر تھے۔آپ کا وجود سرچشمہ فیض اور منبع خیر تھا۔آپ کے علمی کمالات اہل پنجاب کے لیے باعث فخر ہیں۔آپ نے علم ہندسہ اور ہیئت میں بھی اتنا کمال حاصل کیا کہ ان کی جزئیات تک سے واقف تھے۔مُلا محمد صالح کہتے ہیں کہ جب آپ منطق اور معانی پر گفتگو کرتے اور سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے۔جب آپ اپنے شاگردوں میں بیٹھ کر درس دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ عالم بالا سے علم کی بارش آپ کے قلب پر ہو رہی ہے۔

مُلّا یوسف لاہوری

آپ باعمل عالم تھے۔لوگ آپ کے زہد وتقویٰ کی وجہ سے آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔آپ اکبری دور کے مشہور فاضل ملا جمال تلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔آپ نے اپنے والد مولانا جمال کے علاوہ ان کی خدمت میں رہ کر کسب کمال کیا۔آپ کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر مذہبی علوم و فنون کی طرف تھا۔آپ نے تفسیر،حدیث،تاریخ اور دیگر منقولات و معقولات میں فضیلت حاصل کی۔تفسیر پر زیادہ دل جمتا تھا۔اسے خوب پڑھا۔مطالعہ کیا اور اس میں کافی محنت کی۔آخر اس میں یکتائے روزگار ہو گئے۔تفسیر کے رموز کو اتنے عمدہ اور پراثر انداز میں بیان کرتے کہ

دل میں اترتے چلے جاتے۔علوم فلسفہ وحکمت میں اچھی خاصی مہارت تھی۔مگران کی شہرت کا محور قرآنی علوم ہی تھے۔آپ ملا عبدالحمید لاہوری کے قول کے مطابق پچاس برس تک درس دیتے رہے۔بہت سے لوگ آپ سے بہرہ مند ہوئے اور درجہ کمال تک پہنچے۔آپ نے اسی برس کی عمر پائی۔

مُلا جامی لاہوری

بہت بڑے فاضل تھے۔عمر کا اکثر حصہ درس وتدریس میں صرف کیا۔آپ شاعر بھی تھے۔آپ کا انتقال ۱۶۶۱ء میں عہد جہانگیری میں ہوا۔آپ کی قبر احاطہ مزار طاہر بندگیؒ میں ہے۔یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔

مفتی محمد باقر لاہوری

آپ کا شمار لاہور کے ممتاز اور معزز علما میں ہوتا تھا۔آپ شہر کے ایک حصے کے مفتی بھی تھے۔آپ کے نام پر چوہٹہ مفتی باقر اب تک موجود ہے۔وہیں آپ کا مزار بھی ہے۔

مُلّا عبدالحمید لاہوری

ایک زندہ جاوید مورخ تھے۔آپ لاہور کے رہنے والے تھے۔آپ علامہ ابو الفضل کے شاگرد تھے۔آپ کی شہرت کی ابتداء لاہور سے ہوئی جہاں ایک عرصے تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔آپ ٹھٹھہ میں تشریف لے گئے۔وہاں بھی آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔آپ نے بادشاہ کے اصرار پر پر بادشاہ نامہ تاریخ کی نہایت اہم کتاب لکھی جس میں شاہ جہاں کے زمانہ کے سیاسی و تاریخی

حالات کے ساتھ ساتھ تمدن، معاشرت اور تہذیب کے متعلق بھی کافی معلومات ہیں۔

شاہ عنایت قادری شطاریؒ

عالمگیر کے زمانے میں لاہور شریعت و طریقت کا مرکز تھا۔ اس عہد میں جن لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا ان میں شاہ چراغ اور شاہ عنایت خاص شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ عنایت کا تعلق لاہور کے ایک علمی خاندان سے تھا اور درس و تدریس آبائی پیشہ تھا۔ آپ کے والد مولوی پیر محمد لاہور چھوڑ کر قصور آباد ہو گئے۔ شاہ عنایت کی ولادت بھی قصور میں ہی ہوئی۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ نے چھوٹی عمر میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا۔ بارہ برس کی عمر میں آپ نے سند فضلیت حاصل کر لی۔ یہ تو علوم ظاہر کی کیفیت تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے دل میں علوم باطنی کے حصول کا ولولہ پیدا ہوا۔ اور کسی درویش کامل کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ گھومتے پھرتے لاہور پہنچے اور حضرت شاہ محمد رضا کے درس میں شامل ہو گئے۔ ان کی صحبت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہی کے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور اور ان کی سرپرستی میں سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جب آپ نے منزل مقصود کو پا لیا تو آپ کے مرشد نے حکم دیا کہ آپ قصور واپس جائیں۔ قصور میں پنجابی زبان کے دو غیر فانی شعراء سید بلھے شاہ اور سید وارث شاہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ خلقت نے بڑی تیزی سے آپ کی طرف رجوع کیا اور ایک قلیل مدت میں آپ اہل قصور کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔

کچھ عرصے بعد آپ قصور سے لاہور تشریف لے آئے اور یہاں پہنچ کر آپ نے

تدریس علوم ظاہری و باطنی جاری کی۔آپ پچاس برس کی عمر پا کر محمد شاہ کے زمانے میں ۱۷۲۸ء میں فوت ہوئے۔آپ کا مزار لاہور میں چڑیا گھر کے قریب ایک کوٹھی کے احاطے میں ایک مشہور چبوترے پر واقع ہے۔

مولانا عابد لاہوری

آپ بڑے عابد وزاہد تھے۔آپ کے بارے میں اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ ہر رات نماز تہجد میں ساٹھ دفعہ سورہ یٰسین پڑھا کرتے تھے۔آپ کی علمی مجلس میں تقریباً روزانہ دو سو عالم شریک ہوتے تھے۔علم و عمل اور تقویٰ میں آپ یگانہ تھے۔آپ قرآن پاک کے مفسر تھے آپ نے ۱۷۴۷ء میں رمضان مبارک کے مہینے میں وفات پائی۔

مولانا شہر یار

جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر قبضہ کیا تھا۔اس وقت ایک بڑے صاحب دل عالم مولانا شہر یار لاہور میں درس دیا کرتے تھے۔ان کا مدرسہ چینیاں والی مسجد میں تھا۔نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کی حدود کے باہر کے لوگ بھی ان کے درس میں شامل ہوتے تھے۔

حافظ روح اللہ لاہوری

حافظ روح اللہ لاہور کی ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے۔ان کی زندہ کرامت یہ ہے کہ جب آپ نے حج کا ارادہ کیا اور اس نیت سے جہاز پر سوار ہوئے تو راستے میں رمضان شریف کا چاند نمودار ہوا۔جس قدر ہم سفر تھے وہ آپ کے علم و تقویٰ سے متاثر

تھے۔انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ تراویح پڑھائیں۔آپ نے ابھی تک قرآن حفظ نہیں کیا تھا۔مگر آپ نے ان سے وعدہ کرلیا۔آپ روزانہ ایک پارہ حفظ کرتے اور رات کو تراویح میں پڑھتے۔اس طرح تیس دن میں آپ نے قرآن پاک حفظ کرلیا۔
آپ ۱۷۸۷ء میں دنیا میں تشریف لائے بچپن ہی سے آپ کو تحصیل علم کا بڑا شوق تھا۔ مختلف درسگاہوں میں حاضر ہوکر صرف ونحو، منطق، فلسفہ، معانی اور حدیث وتفسیر میں کمال حاصل کیا۔اپنے اساتذہ میں انہیں مولوی محمد سلیم لاہوری سے بہت عقیدت تھی۔تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے درس کا سلسلہ شروع کیا۔آپ کا انتقال یمن میں ۱۸۲۸ء میں ہوا۔

مولوی غلام فرید

اپنے وقت کے علامہ تھے۔ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع، زاہد وعابد صوفی تھے۔دنیا داروں سے دور دور رہتے تھے۔وقت کا بیشتر حصہ درس میں گزارتے۔باقی جو وقت بچتا اسے ذکر وفکر میں بسر کرتے۔آپ کے صاجزادے مولوی غلام رسول اپنے زمانے میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔آپ اگر فلسفہ ومنطق میں ید طولیٰ رکھتے تھے تو تفسیر حدیث میں بھی یگانہ روزگار تھے،آپ نے ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔

مولوی جان محمد لاہوری

مولوی جان محمد لاہوری عالم فاضل اور بے نظیر واعظ تھے۔علم کی ہر شاخ پر ان کی نظر تھی۔بڑے متقی، پرہیز گار اور سنت کے سخت پابند تھے۔بڑی مدت تک لاہور میں درس دیتے رہے۔بہت سی کتابیں لکھیں۔ان کا وعظ بڑا پر تاثیر ہوتا تھا۔جو آپ کے

وعظ میں شریک ہوتا تائب ہو کر اٹھتا۔ آپ کے درس میں شامل ہونے والے علم اور عمل کا پیکر بن کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ انہوں نے پنجاب کے گوشے گوشے میں علم کا نور پھیلایا۔ یہ کہنا وقت کے خلاف نہ ہوگا کہ جو مولوی جان محمد لاہوری کے فیض سے محروم رہا ہو۔ آپ کا درس کشمیری بازار میں مسجد نور الایمان والا میں برسوں قائم رہا۔

مولوی غلام محی الدین بگوی

ضلع جہلم میں ایک گاؤں بگہ ہے۔ یہ کسی زمانے میں بڑا تعلیمی مرکز تھا۔ یہاں ایک خاندان آباد تھا جس میں پشت ہا پشت سے حفاظ چلے آتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر صاحب تقویٰ ہوتے تھے مولوی غلام محی الدین بگوی بھی اسی خاندان میں سے تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی احمد دین بھی حافظ قرآن تھے۔ آپ نے علمائے پنجاب سے پڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر آپ اپنے چھوٹے بھائی احمد دین کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے، اور بارہ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ علم حدیث دونوں بھائیوں نے شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولوی اسحاق محدث دہلوی سے پڑھا۔ وہ آپ کی ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کو شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے حدیث کے بارے میں بہت سے سوالات کیے جن کا آپ نے تسلی بخش جواب دیا۔ شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ آپ کے حق میں دعائے خیر کی اور سند حدیث بھی عطا فرمائی۔ جب آپ رخصت ہونے لگے تو نصیحت کی کہ وطن جا کر کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں میں تفرقہ پھیلے۔ جاؤ لوگوں کو آپ سے بڑا فیض حاصل ہوگا۔ آپ لاہور واپس آئے اور تیس برس تک لال مسجد میں درس دیتے رہے۔

مولوی احمد دین بگوی

آپ مولوی غلام محی الدین بگوی کے چھوٹے بھائی تھے۔عجیب اتفاق ہے کہ آپ اپنے بھائی سے تیرہ برس چھوٹے تھے اور آپ کی وفات بھی بھائی کی وفات کے تیرہ برس بعد ہوئی۔آپ نے شرح وقائع تک اپنے بھائی سے پڑھا۔پھر بھائی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔وہاں چودہ برس رہے اور مختلف علوم وفنون میں کمال حاصل کیا۔ حدیث شریف آپ نے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے پڑھی اور انہی سے اجازات حاصل کی۔آپ ہمہ وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہتے یا چلتے پھرتے صحت و بیماری میں طالبان علم کو سبق پڑھاتے۔مروت کا یہ عالم تھا کہ کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے لیے اپنے ہاتھ سے دور تیار کرتے۔اسے پلاتے۔جب تک وہ بیمار رہتا اس کی تیمارداری کرتے۔آپ چھ ماہ بگہ میں درس دیتے اور چھ ماہ لاہور میں۔ہزارہا عالم ان دونوں بھائیوں کے درس سے فیض یاب ہوئے۔چونکہ آپ ہر وقت درس یا ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔اس لیے آپ نے بہت کم تصانیف چھوڑیں۔آپ کا مزار بگہ میں ہے۔

مولوی حافظ غلام رسول

آپ بڑے مشہور اور امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔اس خاندان کا مورث اعلیٰ بابا حاجی نور محمد سکھیا ہے۔ان کا محل سفید رنگ کا تھا۔آپ اپنے وقت کے بہت بڑے سوداگر تھے۔آپ کے خاندان میں نسلاً بعد نسل حافظ قرآن ہوتے چلے آئے ہیں۔آپ تجارت کے ساتھ درس و تدریس اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری

رکھتے تھے۔آپ محلّہ پیر گیلا نیاں کی مسجد میں عصر سے لے کر عشاء تک وعظ کہتے اور درس دیا کرتے تھے۔ بڑی لمبی عمر پا کر ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔

مولوی محمد دین فوق

اسی خاندان سے ایک اور فاضل اجل بھی پیدا ہوئے۔ان کا نام ابوالحسن محمد معروف بہ مولوی محمد دین فوقی تھا۔آپ ۱۸۵۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا۔ پھر لاہور، کشمیر اور دیگر مقامات پر مشاہیر علماء سے استفادہ علوم کیا۔آپ کا وعظ بڑا پر تاثیر ہوتا تھا۔ بڑی چھوٹی عمر میں آپ نے سند فضلیت حاصل کی ابھی آپ بیس برس کے نہ ہوئے تھے کہ صاحب درس ہوگئے۔آپ نے بادشاہی مسجد میں بھی وعظ کیا جہاں نامی علماء موجود ہوتے تھے۔یہیں آپ کا تعارف خان بہادر فقیر شمس الدین سے ہوا جو آخر دم تک آپ کی قدر کرتے رہے۔آپ نے پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے امتحانات پاس کیے۔۱۸۷۳ء میں آپ اورینٹل کالج میں استاد لے لیے گئے۔آپ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے۔

مدرسہ شیخ جان محمد سہروردی

جس جگہ آج کل گنبد نصرت جنگ واقع ہے یہاں ایک عظیم الشان مسجد اور مدرسہ ہوتا تھا۔ یہ مسجد قصاب خانے کی مسجد کہلاتی تھی۔ یہاں آپ درس دیا کرتے تھے۔آپ نہایت فاضل، ظاہری اور باطنی کمال کے جامع تھے۔آپ کی بے نیازی اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ آپ سے ہزاروں آدمی پڑھتے مگر آپ کسی سے کچھ نہ لیتے تھے۔کوئی کچھ پیش کرتا بھی تو آپ انکار کر دیتے چکی پیس کر روٹی کماتے۔درس کے

علاوہ آپ مسجد کے امام بھی تھے۔ مفتی غلام سرور کا بیان ہے کہ جب میاں صاحب کا چرچا عام ہوا تو لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہماری مسجدوں میں بھی وعظ شروع کریں۔ آپ نے اپنے مرید کو وہاں بھیج دیا۔ آپ کا مزار مسجد کے متصل بنایا گیا۔

مُلا یزید

نویں صدی ہجری کے وسط میں گیلان کا ایک سید گھرانا وہاں سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوا۔ یہ خانوادہ اپنے علاقہ میں علمی شہرت رکھتا تھا۔ ادب سے اور مذہبی علوم سے بھی لگاؤ تھا۔ ملتان پہنچ کر اس خاندان کے جس بزرگ نے سب سے پہلے گمنامی سے نکل کر شہرت حاصل کی وہ سید نجم الدین تھے۔ بابر بادشاہ انہیں دہلی لے گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے بایزید نے علوم وفنون میں کمال حاصل کرنے کے بعد سند فضلیت حاصل کی۔ دہلی سے لاہور آئے اور یہاں درس شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی۔ علم کے پیاسے آپ کی خدمت میں آتے۔ فیض یاب ہوتے اور صاحب درس بن کر نکلتے۔

مولوی عبدالحکیم گیلانی

ملاّ یزید کے تین بیٹے تھے۔ مگر ان تینوں میں سے سید عبدالحکیم کو سب سے بڑھ کر شہرت ملی۔ وہ جہانگیری دور حکومت میں جوان ہوئے۔ علوم وفنون میں کمال حاصل کیا اور باپ کی گدی سنبھالی۔ انہوں نے اس جوش وخروش سے کام کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر جگہ ان کا نام گونجنے لگے۔ انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ ان کا مقبرہ شاہ شمس قادری کے مزار کے مغرب کی طرف گورنمنٹ ہاؤس کے جنوب میں واقع تھا۔

مولوی عبدالحکیم بڑے متوکل اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ دربار شاہی میں حاضری کے لیے آپ کو بار بار دعوت دی گئی۔ مگر آپ ہر بار ٹال دیتے اور پوری دل جمعی سے درس و تدریس میں مصروف رہے۔ آپ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے۔ شاگردوں کے لیے آپ کی ذات ہمیشہ چشمہ فیض رہی۔

علما اور مصنّفین

لاہور کی مسلم نو آبادی میں کسی ممتاز عالم کا پانچویں صدی ہجری (گیارہویں عیسوی) میں ظہور نہ ہونا، قابل تعجب نہیں کیونکہ یہ شہر ''ولایت ہند'' کے صدر مقام بنائے جانے کے بعد بھی دراصل فوجی چھاؤنی کی نوعیت رکھتا تھا۔ دوسرے غزنوی خاندان کے آخری دسو بادشاہوں کو چھوڑ کو باقی زیرنظر مدت میں وہ محض صوبائی شہر رہا۔ اس وقت کے تمدن کی عام ترکیب یہ تھی کہ علم و ہنر کے مرکز عموماً صرف بادشاہی شہر ہوا کرتے تھے۔ بایں ہمہ تعجب ہوسکتا ہے تو اس بات پر کہ بسنے کے بعد ہی اسے حضرت ہجویریؒ جیسے فاضل صوفی نے سکونت کے لیے منتخب کیا اور استاد رومی اور مسعود سعد جیسے بلند پایہ شاعر خاک لاہور سے سر بلند ہوئے کہ سخن سرای کے سوا اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت سے متصف تھے۔

سراج الدین ابن منہاج الدین عثمان

طبقات ناصری کے فاضل مولف قاضی منہاج سراج کے والد کا نام ہے۔ وہ اپنے دادا کا ہم نام تھا۔ دوسرے اپنے نام کے ساتھ باپ کا نام بھی شامل کرتا ہے۔ انہی وجوہ سے بعض تذکروں میں باپ کے بجائے خود اسے (یعنی مورخ کو) لاہوری

تحریر کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں اگر چہ اس کا خاندان بہت کچھ لاہوری ہو گیا تھا۔
مولانا سراج الدین کے کسی تصنیفی کارنامے کا ذکر ہم نہیں سنتے لیکن صاحب طبقات کا
یہ بیان ہے کہ ان کے مواعظ حسنہ اور تقریر کی فصاحت و بلاغت نے بہاؤالدین کو بندۂ
بے دام بنا لیا تھا اور اس نے اپنی ریاست کے جملہ امور شرعی کا انتظام ان کے تفویض
کر دیا تھا۔ مولانا سراج الدین کے فیروزہ گوہ جانے اور وہیں شادی کرنے سے ان کا
تعلق لاہور سے عملاً منقطع ہو گیا۔ تاہم یہاں ان کا ترجمہ پورا کرنے کے لیے اجمالاً
اتنا اور لکھ دینا مناسب ہو گا کہ آخر میں انہیں سلطان غیاث الدین غوری کی طرف سے
سفیر بنا کر دارالخلافہ بغداد بھیجا گیا ہے۔ لیکن راستے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نصر اللہ فرقدی

اس شاعر کے صحیح نام کے متعلق علامہ قزوینی کو شبہ رہا۔ ایک بعد کے تذکرہ نویس
اسے ابوالمعالی کمال الدین تحریر کرتے ہیں۔ عوفی کا بیان ہے کہ وہ انشا پردازی میں
یگانہ عصر مانا جاتا تھا۔ سلطان معزالدولہ بہرام غزنوی کے عہد میں کتاب کلیہ و دمنہ کے
ایک فارسی ترجمے کا ہم ذکر سن چکے ہیں۔ فرقدی نے اسے از سر نو ترجمہ کیا اور فارسی
انشا پردازی کا ایک جدید اسلوب اور بلند معیار قائم کر دیا کہ ہر کاتب و دبیر اسے مثالی
نمونہ سمجھتا ہے۔ فرقدی کی نظم و نثر کا کوئی مجموعہ، جہاں تک علم ہے سلامت نہیں رہا۔ بجز
چند رباعیوں کے جنہیں محسن ادب فارسی عوفی نے اپنی کتاب کے چوکھٹے میں جما دیا
ہے۔

فخر مدبر

فخر مدبر کی مشہور تصنیف آداب الحرب والشجاعہ سلطان شمس الدین ایل تُمتمش سے معنون کی گئی تھی لہٰذا ممکن ہے کہ زندگی کے آخری ایام ہندوستان کے لیے دارالسلطنت دہلی میں گزارے ہوں۔شہر لاہور کے بارے میں فخر مدبر نے بیش بہا اطلاعات جمع کی ہیں۔

امام حسن بن محمد صغانی

ان بزرگوار کا پورا نام ''رضی الدین الحسن بن محمد بن الحسن'' ہے۔کنیت ''ابو الفضائل'' یادرکھنی چاہیے کیونکہ اسی حسن صغانی نام کے ایک اور قریب العصر یا امام بداؤں میں گزرے ہیں۔فوائد الفواد میں سلطان لمشائخ کی زبانی ان بداونی صغانی کے حالات آتے ہیں۔سیوطی کا قول کہ امام صغانی کی تعلیم وتربیت غزنی میں ہوئی قرین صحت نظر نہیں آتا۔ ہرچند امام حسن صغانی کی عمر کا بڑا حصہ بغداد میں گزرا اوران کے تدریسی اور تصنیفی مشاغل کا مقام یہی دارالخلافہ رہا لیکن ولادت اورابتدائی تعلیم و تربیت کا شرف لاہور کو حاصل ہے۔امام صغانی کو اصلی شہرت علم حدیث کی خدمت کے طفیل حاصل ہوئی لیکن سچ پوچھیے تو ان کی لسانی خدمات زیادہ حیرت انگیز نظر آتی ہیں۔عربی لغت،صرف ونحو،اور شاعری پر ان کی تصانیف کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس لاہوری فاضل کو زبان عرب پر کس قدر عبور حاصل تھا۔یہ کتابیں جہاں تک ہمیں علم ہے طبع نہیں ہوئیں اور شاید پاکستان و ہند کے کتب خانوں میں مشکل سے دستیاب ہوں گی۔

زکی الدین احمد لاہوری

یہ بزرگ جن سے مولف تذکرہ ملا، عہد خسرو ملک میں صدر قاضی کے عہدے پر فائز ہوں گے کہ وہ انہیں ''شیخ الاسلام'' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔اس نے علمائے لاہور کے متعلق بیش تر معلومات انہی سے حاصل کی اور کئی جگہ ان کی روایات و آرا کو سند میں لایا ہے۔لاہور کا دوسرا فاضل جس سے عوفی نے استفادہ کیا شرف الدین د ماوندی تھا۔

امام حظیر الدین

عونی نے اس بزرگ کا ''صدور وزرا سے لاہور'' میں صرف چند سطری تذکرہ لکھا ہے حالانکہ ان کا پورا نام اور لقب لکھنے میں کفایت نہیں کی۔وہ یہ ہے :امام حظیر الدین، فخر الزہاد محمد بن عبدالملک جرمانی''۔اس سے ہم ان کی علمی فضلیت اور دینی منزلت کا کوئی تصور قائم کر سکتے ہیں۔ان کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تخمین ہوتا ہے کیوں کہ عوفی لاہور آیا تو وہ انتقال کر چکے تھے اوران کی فضل و بزرگی کی مسند پر ان کے فرزند امام مجد الدین متمکن تھے تذکرہ نگاری ان کی متعدد تصانیف درانواع علوم کی مجمل خیر دیتا ہے۔

لاہور کا ذکر تحقیقی مقالات میں بھی موجود ہے۔ جو مسلم اور غیر مسلم طالب علموں نے پنجاب یونیورسٹی کے لیے تحریر کیے۔ان میں سے بعض میں لاہور کا تذکرہ اجمالی ہے اور بعض میں تفصیلی چند مقالہ محققین اوران کے موضوعات درج ذیل ہیں۔

سرداری لال:

۱۸۵۷ء کا غدر اور پنجاب، پریم نارائن بہان: لارڈ ڈلہوزری کا عہد اور محکمہ مال پنجاب کی پالیسی، محمد یونس: پنجاب کا انتظام ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۷ء تک، چرن جیت لال: پنجاب کی تعلیمی ترقی لارڈ رپن کے وائسرائے ہونے تک، محمد حسین: پنجاب ایڈ منسٹریشن ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۷ء جگت سنگھ: پنجاب انتظامیہ انگریز قبضہ صوبائی خودمختاری تک، رام کمار: پنجاب اور اورنگ زیب کے عہد میں، محمد اقبال: پنجاب سوہن لال کی عمدة التواریخ کی روشنی میں، کیشو رنرائن بھٹنا گر: سر رابرٹ منٹگمری پنجاب میں، نرندر سنگھ: لال سنگھ، شخصیت و کردار، رام چندر اگروال: سکھ لڑائیوں میں پنجاب کی حالت، افتخار احمد نسیم: لارڈ ڈلہوزی اور پنجاب، سعید مظفر: پنجاب میں انگریزی تعلیم کی تاریخ، بلونت سنگھ: پنجاب کی سیاسی حالت ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۳ء، رام کمار: پنجاب اورنگ زیب کے عہد میں، ارور چند: پنجاب جہانگیر اور شاہ جہان کے زمانے میں، کلدیپ سنگھ نارنگ: پنجاب کا الحاق۔ پنجاب کے متعلق مقالات میں لاہور کا ذکر کہیں اجمالاً ہے اور کہیں تفصیلاً لیکن لاہور کے موضوع پر جو مقالات خصوصی طور پر قلمبند ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں۔ لاہور برٹش ایجنسی ۱۸۴۶ء از نرس سنگھ، لاہور میونسپل کمیٹی ۱۹۲۱ء تا ۱۹۶۵ء از اعجاز احمد، لاہور ریزیڈنسی از لودھی پرشاد شلگو، لاہور دربار ۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۳ء از بلونت سنگھ، لاہور مٹکاف مشن از امیر احمد صدیقی، لاہور ایجنسی از بلدیو راج کپور، لاہور سلطنت کا زوال، مہاراجہ شیر سنگھ کی وفات کے بعد از موہن لال اہلو والیا۔

پنجابی میں شہر لاہور دی تاریخ کرنل بھولا ناتھ نے لکھی، جو غالباً ۱۹۳۳ء میں

شائع ہوئی۔اس کے علاوہ مولا بخش کشتہ کی کتاب پنجابی شاعراں دا تذکرہ بھی لاہور کے متعدد نقوش اجاگر کرتا ہے۔ یہ تذکرہ آج سے تقریباً تیس سال قبل منصۂ شہود پر آیا تھا،علاوہ ازیں لاہور کی تاریخ وثقافت پر کئی رسائل واخبارات کے خصوصی نمبر بھی نکلے ہیں۔جن میں نقوش اور نیرنگ خیال کے لاہور نمبر قابل ذکر ہیں۔

عربی و فارسی اور انگریزی و پنجابی کتب اور اردو انگریزی میں لکھے گئے تحقیقی مقالات کے علاوہ لاہور کا ذکر جن اردو کتابوں میں اجمالی یا تفصیلی طور پر موجود ہے،ان میں سرسید احمد کی آثار الصنادید،مولوی ذکا اللہ کی تاریخ ہند،غلام محی الدین کی تاریخ پنجاب،شمس اللہ قادری کی مورخین ہند،عزت اللہ کی ہمارا پنجاب،مہدی حسین ناصری کی صنادید عجم،پروفیسر سیتا رام کوہلی کی مہاراجہ رنجیت سنگھ،سید صباح الدین عبدالرحمان کی تالیفات بزم تیموریہ،بزم مملوکیہ اور بزم صوفیہ،مفتی غلام سرور لاہوری کی تاریخ مخزن پنجاب،منشی محمد دین فوق کی یاد رفتگان،پیر غلام دستگیر نامی،تاریخ جلیلہ،رائے کنہیا لال کی تاریخ پنجاب،نمایاں کتابیں ہیں۔بعض کتب تو صرف اور صرف لاہور کے موضوع پر تصنیف کی گئیں مثلاً:۔تحقیقات چشتی: نور احمد چشتی،تاریخ لاہور: کنہیا لال،ماثر لاہور:سید ہاشمی فرید آبادی،تذکرۃ العلماء و المشائخ لاہور،شالامار باغ،لاہور عہد مغلیہ میں :منشی محمد دین فوق،قلعہ لاہور:ولی اللہ خان،بادشاہی مسجد: ڈاکٹر عبداللہ چغتائی،حالات ضلع لاہور:مفتی تاج الدین، شالامار کی سرگزشت :مسعود اکرام کلیم،ضلع لاہور کا جغرافیہ:محکمہ تعلیم (۱۹۰۰) رہنمائے قلعہ لاہور:مولوی محمد حمید خان۔

علامہ اقبال کے قیام لاہور کا اجمالی جائزہ

آباؤاجداد۔خاندان۔ولادت:

علامہ اقبال کی پیدائش پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں ہوئی جو ہمیشہ فضلائے روزگار کی علمی جولانیوں کا مرکز رہا ہے۔ترجمان حقیقت لسان اسلام حکیم الامتہ علامہ اقبال کا مولد اور منشا ہونے کا فخر اسی مقام کو حاصل ہے۔

علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے جو آج سے کوئی اڑھائی سو سال پہلے سترھویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہوا۔یہ خاندان برہمن تھا اس کی گوت ''سپرو''تھی حکیم الامت کے والد شیخ نور محمد ایک صوفی منش بزرگ تھے آپ کے آباؤاجداد نے ترک وطن کیا اور کشمیر سے پنجاب آئے نادر شاہ اور ابدالی کی ترک تازیوں کے بعد جب سکھ گردی کا دور آیا کشمیر کا رشتہ دولت مغلیہ سے کٹ گیا۔کشمیر افغانوں کے قبضہ میں آگیا لوٹ کھسوٹ اور بدنظمی کے اس دور میں کشمیری مسلمانوں کے لیے امن و عافیت کے ساتھ ساتھ کسب معاش کی راہیں بھی مسدود ہوگئیں۔اس پر اشوب زمانے میں اکثر اور بیشتر خاندانوں نے پنجاب کا رخ کیا کچھ خاندان سیالکوٹ آئے اور یہیں بس گئے۔کشمیری محلے کے نام سے ایک محلّہ بھی آباد ہوگیا۔شیخ نور محمد اسی محلے سے ملحق ایک چھوٹی سی گلی چوڑی گراں میں رہتے تھے مکان چھوٹا تھا۔

کچھ کچا کچھ پکا۔ایک ڈیوڑھی،ایک دلان دوکوٹھریاں۔

حکیم الامت اسی مکان میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ءکو پیدا ہوئے۔حکیم الامت علامہ اقبال کی تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ءجیسا کہ ڈاکٹریٹ کے مقالہ پیش کرتے ہوئے بطور تعارف انہوں نے اپنے تذکرہ حیات میں یہی تاریخ خود لکھی۔

حکیم الامت کے والد شیخ نور محمد کسب معاش کے لیے باپ کے ساتھ بزازی کی دوکان پر بیٹھتے پارچہ دوزی کا پیشہ اختیار کیا برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔دھسوں کا کاروبار بھی کیا۔یہ کاروبار خاصا نفع مند رہا۔رفتہ رفتہ مالی حالت سدھرنے لگی۔ورنہ گزراوقات معمولی تھا۔آپکی ناک چھیدی ہوئی تھی اسی وجہ سے نور محمد عرف نتھو خاں (میاں جی) ٹوپیاں والے مشہور ہوگئے آپ نے ۹۰ سال کی عمر میں ۱۹۲۹ء میں وصال فرمایا۔

علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی صاحبہ بڑی نیک سیرت۔سمجھ دار اور صوم صلوۃ کی پابند تھیں۔وہ ہر دلعزیز خاتون تھیں۔علامہ اقبال اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔وہ گھر کام کاج خود کرتی تھیں گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔علامہ اقبال کی چار بہنیں اور ایک بڑے بھائی تھے جن کا نام شیخ عطا محمد تھا۔علامہ اقبال کی والدہ کا ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔علامہ اقبال نے ان کی وفات پر ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے نام سے ایک رقت انگیز مرثیہ تحریر فرمایا جو بانگ درا میں شامل ہے۔

علامہ اقبال کا بچپن علامہ اقبال کا بچپن اسی طرح کا تھا جیسا غریب اور متوسط الحال شرفاء کے بچوں کا ہوتا ہے لیکن روایات متواترہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ذہانت ومتانت میں دوسرے بچوں سے بڑھے ہوئے تھے۔طفلانہ آوارہ گردی سے

آپ کونفرت تھی۔ مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے مطابق اس وقت سیالکوٹ میں چار مراکز دروس و تدریس تھے۔ علامہ اقبال کے والد کا مذہب کی طرف بہت رجحان تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے بچے کوصرف دینی تعلیم دلوائیں لہٰذا علامہ اقبال نے ہوش سنبھالا تو آپ کوعمر شاہ کے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ یہ مولانا میر حسن کے ہم زاد تھے اور مسجد حکیم حسام الدین میں بچوں کو پڑھاتے تھے اس مکتب میں علامہ اقبال نے نوشت وخواند سیکھی، قرآن پاک پڑھا۔ اسی دوران میں آپ کے والد نے آپ کو مولانا غلام حسن کے مدرسے بھیج دیا۔ مقصد یہ تھا کہ علامہ اقبال دینی تعلیم حاصل کریں۔ اس کے بعد آپ کو میر حسن کے پاس بھیج دیا گیا اور مولانا میر حسن کا دم آخر تک محمد اقبال سے رشتہ تلمذ برابر قائم رہا۔

علامہ اقبال کے شوق علم اور فہم وادراک کا یہ عالم تھا کہ میر حسن کو شاگرد کی آمد کا انتظار رہتا کہ شاگرد آئے تو سبق شروع کریں۔ دیر ہو جاتی تو پوچھتے محمد اقبال کہاں ہے؟ اُردو، عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے اسکاچ مشن ہائی سکول میں داخلہ لیا۔

محمد اقبال کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا۔ میر حسن کے درس میں آئے تو کہنے کو ان کی تعلیم عربی، فارسی سے شروع ہوئی۔ درحقیقت اسلام اور اسلامی علوم و معارف کی تحصیل سے جس میں میر حسن کی راہنمائی جیسے انہیں ماضی کی طرف لے گئی۔ اس دعوت کے خدوخال ابھرنے لگے جس نے نوع انسانی کا رخ اسکی تقدیر اور مستقبل کی طرف پھیر دیا۔ وہ شخصیتیں سامنے آنے لگیں جن کے ایمان و یقین اور علم و عمل نے انسانیت کا روپ سنوارا۔ اس تہذیب وتمدن کی جھلک دکھائی دینے لگی جس

کا عہد عروج و کامرانی تھا، ایک دور زوال و انحطاط یوں علامہ اقبال کے ذہن میں اسلام کی شان و شوکت، اسلام کی سطوت اور جہاں گیری کے ساتھ ساتھ بتدریج یہ احساس بیدار ہو گیا کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ اس کا مزاج اور رخ کیا ہے؟ اسکول اور کالج میں وہ ایک نئی زبان، نئے ادب، نئے علوم وفنون اور نئی تہذیب و تمدن سے آشنا ہو رہے تھے۔ وہ ان کی تحصیل میں اسی شوق اور لگن سے آگے بڑھے جیسے اسلامی علم و حکمت کے اکتساب ہیں۔ اور یوں علامہ اقبال کا رشتہ ماضی اور حال سے استوار ہوتا چلا گیا۔

داخلہ سکاچ مشن سکول اور پہلی شادی

میر حسن شاہ صاحب نے ہی علامہ اقبال کو سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل کرا دیا جس میں وہ خود مدرس مقرر ہو گئے۔ ۱۸۹۱ء میں علامہ اقبال نے مڈل کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۳ء میں انٹرنس کیا۔ آپ نے انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ سکاچ مشن سکول سے ایف اے پاس کر کے آپ مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ چونکہ میر حسن نے سالہا سال تک علامہ اقبال کو عربی، فارسی، علم و حکمت، ادبیات تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر صحیح راستے پر لگا دیا تھا اور اُن میں علوم قدیمیہ و اسلامیہ کے لیے بے پناہ تشنگی پیدا کر دی تھی۔ آپ نے ۱۸۹۵ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت اسکاچ مشن سکول و کالج میں بی۔ اے تک کی تدریس کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس لیے علامہ اقبال کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا گیا۔ علامہ اقبال شروع ہی سے محنت کے عادی تھے آپ کی جو درسی کتابیں محفوظ ہیں ان پر لکھے تشریحی نوٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت زیادہ محنتی

تھے۔ایف اے کے امتحان کے دوران ہی گجرات کے ایک دولت مند بزرگ، ڈاکٹر عطا محمد نے انہیں دیکھا تو پسند فرمایا اور اپنی بیٹی کے لیے رشتہ چاہا۔

علامہ اقبال نہیں چاہتے تھے کہ کم سنی میں شادی کر لیں لیکن بزرگوں کا حکم نہیں ٹال سکتے تھے۔مان گئے۔برات سیالکوٹ سے گجرات جانے کے لیے تیار ہوئی آپ گھوڑے پر بیٹھ گئے تو امتحان میں کامیابی کا تار آیا۔بیٹی کا نام معراج بیگم اور بیٹے کا نام آفتاب اقبال رکھا۔آفتاب نے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی کراچی میں آسودۂ خاک ہیں۔علامہ اقبال کی یہ شادی ناکام رہی۔

بحیثیت طالب علم گورنمنٹ کالج لاہور:

۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے کی کلاس میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۸۹۷ء میں بی۔اے کے امتحان میں سیکنڈ ڈویژن حاصل کی اور عربی میں مضمون میں اول آئے بی۔اے پاس کرنے کے بعد ایم۔اے فلسفہ کی جماعت میں داخل ہو گئے۔

دسمبر ۱۸۹۸ء میں آپ نے ایم۔اے کے امتحان کی تیاری کے ساتھ قانون کا ابتدائی امتحان F.E.L دیا لیکن اس کے فلسفہ (Jurisprudence) کے پرچہ میں فیل ہو گئے۔مارچ ۱۸۹۹ء میں ایم اے فلسفہ کا امتحان دیا اور تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہو گئے۔

لاہور میں ملازمتیں (میکلوڈ عربک ریڈر، پنجاب یونیورسٹی)۱۸۹۹ء تا۱۹۰۳ء

ایم اے فلسفہ میں کامیاب ہونے کے بعد ۱۳مئی ۱۸۹۹ء کو یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ یہ منصب ریسرچ سکالر کا تھا جس کی میعاد دو سال کی تھی آپ نے ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء تک میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے یونیورسٹی اورینٹل کالج میں تحقیق وتصنیف، درس وتدریس، عربی اور اردو مطبوعات کی تنظیم کے فرائض سرانجام دیئے۔جنوری ۱۹۰۱ء تا مارچ ۱۹۰۲ء کی رخصت کے دوران آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے اسٹنٹ مقرر ہوگئے۔اسی رخصت کے دوران آپ نے E.A.C کا امتحان دیا لیکن طبعی بورڈ نے انہیں ناموزوں قرار دیا۔۱۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء تک آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے ایڈیشنل پروفیسر کے طور پر کام کیا۔اسی دوران آپ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ جانے کی خواہش ہوئی۔۳۱ مئی ۱۹۰۳ء کے بعد آپ نے میکلوڈ عربک ریڈر کے منصب سے رخصت لے لی۔

جنوری ۱۹۰۱ء تا مارچ ۱۹۰۲ء کی رخصت کے دوران آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوگئے۔اسی رخصت کے دوران آپ نے E.A.C ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا امتحان دیا لیکن طبی بورڈ نے انہیں ناموزوں قرار دیا۔۱۸ اکتوبر ۱۹۰۲ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء تک آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے ایڈیشنل پروفیسر کے طور پر کام کیا۔اسی دوران آپ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ جانے کی خواہش ہوئی۔۳۱ مئی ۱۹۰۳ء کے بعد آپ نے

میکلوڈ عربک ریڈر کے منصب سے رخصت لے لی۔

(اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور) ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء

۳ جون ۱۹۰۳ء سے علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے ۲۶ فروری ۱۹۰۴ء کو پروفیسر تھامس آرنلڈ گورنمنٹ کالج سے سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے اور آپ نے اُن کے فراق میں نظم ''نالہ فرق'' بھی لکھی۔ انہی دنوں علامہ اقبال کے دوست شیخ عبد القادر مدیر مخزن اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ تعلیمی مصارف برداشت کرنے کی حامی ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے بھر لی۔ اور علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے تین سال کی رخصت لے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔

کیمبرج میں داخلہ:

پروفیسر آرنلڈ کی کوشش سے علامہ اقبال کو ٹرینٹی کالج کیمبرج میں آسانی سے داخلہ مل گیا اور قیام و طعام کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو گیا انہوں نے فلسفیانہ مطالعے اور تحقیقی انہماک سے فلسفہ اخلاق پر ایک مقالہ لکھ کر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے بعد لنکنز ان میں قانون کا درس بھی دیتے رہے۔ علامہ اقبال نے ۱۹۰۷ء میں اپنا تحقیقی مقالہ ''ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' مکمل کر لیا۔ جسے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پیش کیا گیا۔

جولائی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتے میں علامہ اقبال جرمنی پہنچے ہائیڈل برگ اور میونخ میں چند ماہ قیام کر کے جرمن زبان اور فلسفے میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ زبانی

امتحان میں کامیاب ہو کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کر لی۔ یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۰۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ جرمنی سے لندن آ کر لنکنز ان میں بیرسٹر لاء کی تعلیم مکمل کی اور چند ماہ پروفیسر آرنلڈ کی جگہ یونیورسٹی کالج لندن میں معلم عربی کے فرائض سرانجام دیئے۔

یورپ سے واپسی:

۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء میں علامہ اقبال اپنی ذہانت کا سکہ انگلستان اور جرمنی والوں پر بٹھا کر اپنے وطن واپس آئے اور اگلے روز اپنے والدین کی قدم بوسی کے لیے لاہور سے سیالکوٹ چلے گئے۔ایک دو ماہ قیام کے بعد لاہور میں وکالت کا کام شروع کر دیا۔مگر وکالت کو علامہ اقبال کی زندگی میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ اپنا دماغی بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کام ہی نہیں لیتے تھے ان کی زندگی کی ساری پونجی ان کا حیات افروز کلام ہے۔یکم مئی ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر کا انتقال ہو گیا۔تو حکومت کے توسط سے چیف کورٹ میں ان کے مقدمات کی پیشی کا خاص انتظام کر کے انہیں قائم مقام پروفیسر فلسفہ مقرر کیا گیا اور دسمبر ۱۹۱۰ء تک آپ نے یہ خدمت سرانجام دی۔

یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو نئے پروفیسر کے آنے سے علامہ اقبال اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے اور شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔دراصل اس وقت ہندوستانی اور بین الاقوامی سیاست نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی آپ اس سے بے حد متاثر ہوئے گورنر پنجاب نے بھی آپ کو پروفیسری کی پیش کش کی لیکن آپ نے قبول نہ کیا اور معذرت کی۔آپ قوم کو ایک پیغام دینا چاہتے تھے اور اگر سرکاری ملازمت میں رہتے تو جو کچھ کہنا چاہتے تھے بے تکلف نہ کہہ سکتے تھے۔

اقبال اور لاہور

بچپن کے شوق اور شعروشاعری کا آغاز:

بچپن میں علامہ اقبال کو بیٹرے پالنے، کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ مولانا میر حسن کے صاحب زادے سید محمد تقی ان مشاغل میں شریک تھے۔ اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ مولانا میر حسن نے دیکھا کہ علامہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بیٹر تھام رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کم بخت اس میں تجھے کیا ملتا ہے؟ اس پر علامہ اقبال نے برجستہ جواب دیا حضرت اسے پکڑ کر تو دیکھئے۔ میر حسن نے کہا علم کتابوں میں تلاش کرو۔ کبوتروں کی پرواز سے عملی جدوجہد ہی کو تحریک ملتی ہے۔ یہ تھی میر حسن کی خوبی تربیت کہ کبوتروں سے لگاؤ اور کبوتر بازی میں بھی تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ایک عملی تجسس پیدا ہو گیا۔ علامہ اقبال کے خیال میں کہ جب کبوتروں کو پہنائے فضا میں پرواز کرتے دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر رہا ہوں کبوتروں کی پرواز اور آسمان پر پروازی علامہ اقبال کی شاعرانہ اور فلسفہ پسند طبیعت کو بہت مرعوب تھی۔ کبوتروں کا شوق انہیں کافی عرصہ رہا۔ کبوتروں سے شغف کا یہ عالم تھا کہ سیالکوٹ سے لاہور آئے تو کبوتر ساتھ لائے۔ یورپ سے واپس

آ کر انارکلی میں اقامت اختیار کی تو کبوتر بھی ساتھ لے آئے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی منتقل ہوئے تو کبوتروں کے لیے کابک تیار کروائے۔ جب جاوید اقبال پیدا ہوئے تو اس شوق کو ہمیشہ کے خیر باد کہا۔

ا- داغ سے تلمذ ب۔ لاہور کے مشاعروں میں اقبال کی شرکت:

علامہ اقبال کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ آپ بڑی خوش گلو اور پر سوز آواز کے مالک تھے آپ منظوم قصے بڑے پیارے انداز میں سنایا کرتے تھے اور پڑھتے پڑھتے اپنی طرف سے بھی کوئی مصرع جڑ دیتے تھے آپ نے زمانہ طالب علمی ہی میں مشاعروں میں شرکت شروع کر دی تھی۔ علامہ اقبال کی شاعری کی پہلی منزل میں سیالکوٹ سے لے کر یورپ جانے سے پہلے تک کا زمانہ شامل ہے۔ علامہ اقبال کے ابتدائی سترہ اٹھارہ سال سیالکوٹ میں گزرے جہاں سے ۱۸۹۳ء میں میٹرک اور ۱۸۹۵ء میں انٹر کا امتحان پاس کیا تھا۔ مولانا میر حسن کی تعلیم و تربیت سے شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ طبیعت کے فطری شاعرانہ جوہر کی نمود ہونے لگی۔ اسکول کے زمانے میں شعر کہنے لگے حتیٰ کہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ان کی دو غزلیں رسالہ ''زبان دہلی کے شمارہ نمبر ۱۸۹۳ء اور فروری ۱۸۹۴ء میں چھپی تھیں۔ ''شور محشر'' اور ''خذنگ نظر'' میں علامہ اقبال کی ابتدائی غزلیں نظر آتی ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور آنے کے بعد وہ لاہور کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے اسی زمانہ ۱۸۹۳ء میں آپ نے نواب مرزا داغ دہلوی سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینی شروع کر دی اور مرزا داغ جلد پہچان گئے کہ آپ کے کلام میں اصلاح کی بہت کم گنجائش ہے۔ اُس زمانے میں اقبال کا قیام بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر ایک مکان میں تھا۔ آپ نے

زمانے کے مذاق اور وقت کے تقاضوں کے مطابق انگریزی نظموں کو اُردو جامہ پہنانے کی کوشش بھی جسے بہت سراہا گیا۔ اُس وقت پنجاب میں اردو شاعری ابھی ابتدائی حالت میں تھی۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مرزا ارشد گورگانی دہلوی، سر ناظم حسین ناظم لکھنوی، منشی الٰہی بخش رفیق اور ان کے دیگر شاگردوں کے دم قدم سے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں شعر و شاعری کا کچھ چرچا ہو چلا تھا۔ مگر گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ تھی۔ ان بزرگوں سے کچھ فاصلے پر محمد حسین آزاد دہلوی اور خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی اُردو کو ایک الگ نئی شاہراہ پر چلانے کی کوشش کر چکے تھے۔ انہوں نے کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیمات پنجاب کے ایماء سے ۱۸۷۴ء میں ایک جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرع طرح کی بجائے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا اور مشاعرے میں شعراء اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس پر طبع آزمائی کر کے لاتے تھے۔ اس زمانے کا لاہور آج کے لاہور سے مختلف تھا۔ زمانے بھر کے اہل کمال، ادیب اور شاعر سمیٹ کر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور شاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شعراء کو دادِ سخن دیتے تھے۔ اس قسم کی محفل میں علامہ اقبال نے نے اپنی وہ نظم پڑھی جس کے اندر انہیں ایک غیر فانی شعر نے لکھنو اور دہلی کے اساتذہ سخن کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

اس مشاعرے میں شہزادہ مرزا ارشد گورگانی، مرزا محمد عبدالغنی اور میر ناصر حسین دہلوی جیسے شعراء بھی موجود تھے۔ جو اس شعر کو سن کر تصویرِ حیرت بنے ہوئے تھے مرزا

ارشد اچھل پڑے اور کہنے لگے۔ اقبال! اس عمر میں اور یہ شعر؟

اس کے بعد بھی علامہ اقبال نے بھاٹی دروازے کے بعض مشاعروں میں حصہ لیا اور اپنا کلام سنایا جس سے ان کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس کے بعد آپ نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کرنی شروع کی اور ۱۸۹۹ء کے بعد باقاعدگی سے ان جلسوں میں اپنے کلام کا جادو جگاتے رہے اور اس سے ملک کے طول و عرض میں علامہ اقبال کا نام اور کلام خوشبو کی طرح پھیل گیا جس نے پورے برصغیر اور پورے برعظیم کو مہکا دیا۔

انجمن حمایت اسلام کے قیام کا پس منظر:

سلطنت مغلیہ کے زوال سے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کا اندوہناک باب شروع ہوتا ہے۔ ان کی سیاسی قومیت، معاشی ثروت، اخلاقی عظمت اور ثقافتی شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ایک بغاوت اور ایک شرارت سے تعبیر کیا گیا اور اس کی ساری ذمہ داری برادرن وطن اور غیر ملکی فاتحین نے مسلمانوں کے سر ڈال دی۔ انہیں کچلنے کے لیے ایسا طرز حکومت اختیار کیا گیا۔ جس کی بنیاد خوف و ہراس پر تھی۔ اُن کے جذبہ حریت کو دبانے کے لیے ایسے حربے اختیار کیے گئے کہ اُن کے لیے زندگی کے کسی بھی شعبہ میں کوئی باعزت جگہ باقی نہ رہی۔ تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ سکول، فوجی ملازمتوں سے محروم، صنعت و حرفت، تجارت سے بے دخل، قصہ مختصر مغلوب قوم پر بھی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے اور آہستہ آہستہ وہ اسے اپنا مقدر سمجھ کر اخلاقی لحاظ سے بھی رو بہ انحطاط ہونے لگی۔

دوسری طرف ہندوؤں کو بھی ہر طرح کی مراعات دی گئیں۔ تعلیمی اداروں میں داخلے اور سرکاری ملازمتیں دی گئیں۔ وہ صنعت و تجارت پر چھائے ہوئے تھے سیاسی طور پر ان کی اہمیت کو سمجھا جانے لگے اور مسلمان جنہوں نے برصغیر پاک و ہند پر ایک ہزار سال حکومت کی تھی ان کے برابر آگئے اور فوقیت حاصل کر لی۔ انگریزی حکومت کے زیر اثر عیسائی مشنریوں نے ملک کے گوشے گوشے میں عسائیت کی تبلیغ کی اور وہ مسلمانوں کو مذہب سے روگردانی کی ترغیب دے رہے تھے۔ ان کا زیادہ تر ہدف ان پڑھ اور مفلس و نادار مسلمان تھے۔ چنانچہ ان کی مکروہ کوششوں سے ہزاروں مسلمان عسائیت اور آریت کی آغوش میں جانے لگے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکست خوردہ مسلمان اپنے زوال اور انحطاط پر راضی ہو گئے تھے۔ لیکن حزن و یاس کے اس عالم میں ناامیدی و بیقراری کے تاریک دور میں کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جن کے دل نور ایمان سے منور تھے۔

۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے مقاصد یہ تھے قدیم مشرقی علوم کا احیاء۔ باشندگان ملک میں دیسی زبانوں کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت، صنعت و حرفت، تجارت کا فروغ، علمی و ادبی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بحث و نظر، صوبے کے بارسوخ، اہل علم حضرات اور افسران حکومت سے رابطہ۔

بنیادی طور پر یہ ایک علمی اور ادبی انجمن تھی چنانچہ اس کا دائرہ کار محدود تھا۔ با ایں ہمہ اس کی مساعی سے ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو پنجاب یونیورسٹی (موجودہ اورینٹل کالج) اور ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

۱۸۶۹ء میں پنجاب کے مسلمانوں کی پہلی قومی جماعت ''انجمن اسلامیہ پنجاب''

قائم ہوئی۔غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی،تعلیمی اور اخلاقی حالت سنواری جائے۔اس زمانے میں اُن کی مذہبی حالت بے حد افسوس ناک تھی۔فرقہ بندیوں کے باعث مذہبی عناد اور فتنہ فساد کا بازار گرم تھا۔اور اُن کی عظیم الشان اور تاریخی یادگاریں مثلاً شاہی مسجد،سنہری مسجد،مسجد ٹکسالی اور تبرک عالیہ وغیرہ طوائف الملوکی میں ضبط ہو چکے تھے۔انجمن اسلامیہ کے اغراض و مقاصد یہ تھے۔

مسلمانوں کے مذہبی اخلاقی،تعلیمی اور معاشرتی معاملات کے متعلق مفید معلومات سوچنا اور اُن کو عمل میں لانا۔مسلمان طلبہ کی ترقی اور تعلیم کے لیے وظائف بطور قرض حسنہ دینا،مسلمانوں کے اوقاف کی حفاظت،نگرانی اور انتظام اور ان میں توسیع کرنا پر اُس معاملے میں جو کہ مذہب اور اسلام کے منافی نہ ہو حکومت سے تعاون کرنا مسلمانوں کے حقوق کی نسبت حکومت کی خدمت میں حسب ضرورت وفود بھیجنا۔

انجمن اسلامیہ پنجاب کے قیام کے آٹھ سال بعد برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار سر سید احمد خاں میدان میں اُترے۔وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ مسلمانان ہند کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ذلیل وخوار کیا جا رہا ہے۔اور اُن کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنی ترقی کے لیے تن من کی بازی لگا دیں۔جنگ آزادی کے بعد سر سید پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنی پس ماندہ قوم کی اصلاح اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لیے ایک پر امن، آئینی،اور تعلیمی و اصلاحی جدو جہد کا آغاز کیا۔انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کا بڑے پیمانے پر منصوبہ بنایا۔وہ چاہتے تھے کہ تعلیم یافتہ طبقہ جس کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جا رہا ہے از سر نو وسعت اختیار کرے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ تحریک ہے حقیقت میں یہ ایک علمی وادبی تحریک بھی تھی جس کے زیر اثر مسلمان قوم کے فکرونظر میں اہم انقلاب رونما ہوا۔

سرسید ایک دینی مفکر بھی تھے ان معنوں میں نہیں کہ انہوں نے دینی ادب کی گہرائی تک پہنچ کر اس کے حقائق و معارف کو ازسرنو بیان کیا بلکہ اس اعتبار سے کہ انہوں نے اس پر ایک نئے زوایے سے نظر ڈالی۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ مذہب کو علم جدیدہ کی روح اور اُن کے اصول سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔اس لحاظ سے اُن کی اصلاحی تحریک اس تحریک سے بالکل مختلف تھی جس کے علمبر دار سید احمد شہید، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا عبدلقدوس تھے۔سرسید احمد خاں کے افکارونظریات نے اس زمانے کی تقریباً تمام تحریکوں کو متاثر کیا۔اہل پنجاب نے بھی بڑھ کر لبیک کہا۔

قیام انجمن حمایت اسلام:

علی گڑھ تحریک کے آغاز کے ٹھیک سات سال بعد ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا قیام عمل میں آیا۔علی گڑھ تحریک کا دائرہ محدود تھا۔انجمن نے اس کے کام کو آگے بڑھایا۔اسلام اور اسلامی اقدار کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں وہ خدمات سرانجام دیں جو علی گڑھ تحریک سرانجام نہ دے سکی تھی۔اس لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیاء میں ایسا کوئی ادارہ قائم نہیں ہوا جس نے اسلام اور حمایت اسلام کا بیڑہ اٹھایا ہو۔یہ فخر صرف انجمن حمایت اسلام کو حاصل ہے۔

مارچ ۱۸۸۴ء میں باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں ایک پادری عسائیت کی حمایت میں تقریر کررہا تھا۔تقریر کے دوران میں اُس نے نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں بعض نازیبا کلمات کہے۔سامعین میں ایک غیرت مند مسلمان منشی چراغ دین بھی

تھے۔انہوں نے پادری کی اس حرکت پر اُسے ٹوکا اور کہا کہ مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے۔مگر اپنے پیارے رسول ﷺ کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ زمانہ انگریزوں کی اور قوت کا زمانہ تھا اور ہزاروں افراد خوف اور لالچ کے تحت عسائیت قبول کر چکے تھے جن کی بڑی تعداد خاکروبوں اور موچیوں پر مشتمل تھی۔اس مجمع میں ایسے بہت سے لوگ شامل تھے جنہیں منشی چراغ دین دل پر زخم کھا کر وہاں سے منشی محمد کاظم کے مکان پر آئے اور یہ دردناک واقعہ سنایا۔ بعدازاں انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں مختلف لوگوں سے اس موضوع پر گفتگو کی جن میں اس زمانے کے مشہور فاضل شمس العلماء شمس شائق اور حاجی میر شمس الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ بزرگ بلاناغہ جمع ہوتے اور اسلام کے خلاف اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتے۔ان مجالس میں مخالف اور موافق دونوں قسم کی آراء کا اظہار کیا جاتا۔بعض احباب پادریوں کے خلاف محاذ بنانے کی سعی لاحاصل قرار دیتے۔بعض کے نزدیک مسلمانوں کی بے حسی اور پس ماندگی کے پیش نظر صورت حال میں کسی خوشگوار تبدیلی کا رونما ہونا خارج از امکان تھا۔کچھ دردمند بزرگ ایسے بھی تھے جو اپنے عہد کے عظیم قومی راہنما سر سید احمد خاں کی کوششوں کو بارآور ہوتے دیکھ چکے تھے۔اُن کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کو مذہبی، سیاسی اور تعلیمی پسماندگی سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے تو کامیابی کا امکان موجود ہے۔

آخر چھ ماہ کی بحث کے بعد ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو مسجد بکن خاں اندرون موچی دروازہ لاہور میں ایک اجتماع ہوا۔ شرکاء کی تعداد ڈھائی سو کے قریب تھی عام مسلمانوں کے علاوہ لاہور کے بااثر اور نامور بزرگ بھی اس جلسے میں موجود تھے مثلاً

شمس العلماء شمس الدین فائق، مولوی سید احمد علی دہلوی، مولوی دوست محمد، ڈاکٹر دین محمد ناظر، مرزا ارشد گورگانی نے ایک اجتماع قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کے بنیادی مقاصد حسب ذیل قرار پائے۔

۱- عیسائیوں کی تبلیغ کا سد باب۔

۲- مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایسے ادارے قائم کرنا جس میں قدیم و جدید علوم کی تربیت دی جائے۔

۳- مسلمانوں کے یتیم اور لاوارث بچوں کے لیے ایسے ادارے قائم کرنا جن میں پرورش کے علاوہ تعلیم و تربیت بھی کی جائے۔

۴- اسلامی لٹریچر کی اشاعت۔

۵- اس ادارے کا نام انجمن حمایت اسلام تجویز ہوا۔

انجمن حمایت اسلام کا آغاز چون روپے کے حقیر سرمایہ سے ہوا۔۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو مسجد بکن خاں کے اجتماع میں جمع کر لیے گئے تھے اس وقت کا کل سرمایہ یہی کائنات تھی۔ پہلا دفتر حویلی سکندر خاں واقع ڈبی بازار کے ایک کمرے میں کھولا گیا جو اڑھائی روپے ماہوار پر کرایہ پر لے لیا گیا۔ یہاں انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے اور رائے عامہ کو مقاصد انجمن کا ہم خیال بنانے کے لیے مختلف برادریوں کے اکابرین سے تبادلہ خیال کیا جاتا تھا۔

ب۔ انجمن حمایت اسلام میں اقبال کی رکنیت:

علامہ اقبال کی شہرت کا آغاز حقیقی معنوں میں انجمن حمایت اسلام کے رہین منت ہے۔ خلیفہ شجاع الدین اس بیان کرتے ہیں ک کہ انجمن حمایت اسلام کے

ساتھ علامہ اقبال کا تعلق محض حسن اتفاق یا حادثہ نہیں یہ ایک باشعور اور زی حس فرد کا فعال قومی ادارے کے ساتھ ایسا تعلق ہے جسے۔۔۔فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں کی عملی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔انجمن حمایت اسلام کے ساتھ علامہ اقبال کی وابستگی ہماری قوم کا ایک اہم باب ہے۔یہ عزت اور سعادت انجمن حمایت اسلام کی قسمت میں لکھی تھی کہ وہ اقبال کو دنیا سے روشناس کرائے جسے قدرت نے شاعر مشرق اور حکیم الامت بننے کے لیے نامزد کیا تھا۔پچھلی صدی کے آخری عشرے میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے باقاعدہ رکن بن چکے تھے اور یہ رکنیت محض انجمن کے اغراض و مقاصد سے زبانی ہمدردی تک موجود نہ تھی چنانچہ حمایت اسلام کی جنرل کمیٹی کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ نومبر ۱۸۹۹ء کو علامہ اقبال کو مجلس منتظمہ کا رکن منتخب کر لیا گیا تھا۔

۶ مئی ۱۹۰۰ء کے اجلاس میں اسلامیہ کالج میں بی۔اے کی کلاس جاری کرنے کی نسبت فیصلے پر غور کیا گیا اور اس ضمن میں علامہ اقبال کی قرارداد زیر بحث آئی۔

تقرری بحیثیت رکن

۲۶ فروری ۱۹۰۵ء کو مجلس انتظامیہ برائے ۱۹۰۵ء کا انتخاب عمل میں آیا۔علامہ اقبال رکن منتخب کیے گئے۔۱۶ مارچ ۱۹۰۵ء کو انجمن کی جنرل کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔جس میں انجمن کے قواعد مرتب کرنے کے لیے مولوی محبوب عالم وغیرہ نے قرار دادیں پیش کیں۔طے پایا کہ قواعد میں ترمیم و اضافہ کے لیے سب کمیٹی بنائی جائے۔چنانچہ ایک پنج رکنی سب کمیٹی مقرر کی گئی علامہ اقبال اس کے رکن منتخب ہوئے۔ستمبر ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال حصول تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔۱۹۰۸ء میں واپس وطن

تشریف لائے تو ایک بار پھر انجمن کے امور میں دلچسپی لینے لگے۔ ۲۴ جنوری کو مجلس انتظامیہ کے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا۔ علامہ اقبال اس کے رکن منتخب ہوئے۔

بحیثیت رکن جنرل اسمبلی

۲۰ فروری ۱۹۱۰ء کو گریجوایٹ ارکان کے انتخاب کے لیے جنرل سیکرٹری کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں علامہ اقبال کو جنرل سیکرٹری کا رکن منتخب کیا گیا۔

بحیثیت صدر

جون ۱۹۲۴ء سر شیخ عبدالقادر صدر انجمن انڈیا کونسل کی حیثیت سے لندن تشریف لے گئے تو کرسی صدارت خالی ہوگئی۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو علامہ اقبال کو انجمن حمایت اسلام کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ کے چناؤ کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا۔ پیسہ اخبار نے آپ کی تقریر پر اظہار مسرت کرتے ہوئے لکھا۔

> ”مسلمانان پنجاب اس خبر کو سن کر مسرور ہوں گئے کہ انجمن حمایت اسلام لاہور نے علامہ اقبال کو اپنا صدر منتخب کر لیا ہے۔ سر عبدالقادر چونکہ انڈیا کونسل کے رکن مقرر کیے گئے ہیں اور وہ اپنے نئے عہدے کا چارج لینے کے لیے لندن چلے گئے ہیں۔ اس لیے انجمن کی صدارت کی کرسی خالی پڑی تھی اقبال کے سوا اور کونسا دوسرا شخص لائق ہوسکتا تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کے فلاسفر مشرق کے مایہ ناز شاعر، بلند پایہ مقنن اور قومی کاموں میں گہری دلچسپی لینے والے ہیں“۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اقبال کی شرکت:

انجمن حمایت اسلام نے ابھی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہی کی تھیں اور اُس کو وہ مشن جسے اللہ کے بھروسے پر شروع کیا تھا عوام میں مقبولیت حاصل کرنے لگا تھا۔اس وقت انجمن کے سالانہ جلسے شیرانوالہ سکول کے اندرونی میدان میں منعقد ہوا کرتے تھے۔انجمن کے پلیٹ فارم پر پہلی مرتبہ ۱۸۹۹ء میں علامہ اقبال جلوہ افروز ہوئے اور نالہ یتیم کے عنوان سے ۱۹۰۰ء میں نظم پڑھی۔مولانا نذیر احمد اور علامہ اقبال اُن بزرگوں میں سے ہیں جن کی سخن وری کی سحر آفرینی اور جن کے قلم کی جادوگری مسلمانوں بلکہ دوسری اقوام کو بھی انجمن کے اجلاس میں جوق در جوق کشاں کشاں کھینچ لاتی تھی۔اوران کے ایک ایک فقرہ فقرہ پر ایک ایک شعر پر تحسین وآفرین کے نعروں میں سینکڑوں ہزاروں روپے انجمن کے خزانوں میں بن مانگے چلے آتے تھے۔مولا نذیر احمد جنہیں خدا غریق رحمت کرے پہلے بزرگ ہیں جن کی زبان نے خلائق کو انجمن کے اجلاسوں میں شامل ہونے اور دلچسپی لینے کا شوق دلایا اور انجمن کی روز بروز بڑھائی۔انجمن کے اجلاسوں میں خلقت کا وہ ہجوم نظر آنے لگا جو کسی اور مجلس کو نصیب نہ ہوا۔اُن کی حیات میں اُن کے ساتھ ساتھ اوران کی وفات پر تن تنہا اقبال کی ترنم ریزیوں نے ہندو مسلمانوں کو، بوڑھوں اور جوانوں کو بالخصوص کالجوں کے طلبا کو اس مقناطیسی کشش سے کھینچا کہ بعض اوقات انجمن والوں کو اپنے اپنے اجلاس کی احاطہ بندی جو میان میں قناتوں اور شامیانوں سے کی ہوئی تھی توڑنی پڑتی تھی۔اور سننے والوں کا اژدھام اس قدر ہو جاتا تھا کہ کارکنان انجمن اس کا انتظام مشکل سے کر سکتے تھے۔لیکن جب علامہ اقبال کھڑے ہوتے تو سناٹا چھا جاتا۔علامہ پڑھتے جاتے اور

سننے والے مسحور ہوتے جاتے تھے روپوں کا مینہ برستا تھا۔ چندہ دینے میں ہر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہوتا۔ علامہ اقبال پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تھے یا کارکنان انجمن کو وصولی چندہ قلمبند کے لیے مہلت دینے کی غرض سے چند منٹوں کے لیے خاموش ہو جاتے تھے۔ لوگ بے تاب ہو جاتے تو علامہ پھر پڑھنا شروع کر دیتے اور سامعین کی جیبیں خالی کرا لیتے۔

انجمن حمایت اسلام کے ان جلسوں میں برصغیر پاک و ہند کے ممتاز علماء و شعراء سیاست دان اور قومی راہنما شریک ہوتے اور خطاب کرتے اور مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل کے سلسلے میں اُن کی راہنمائی کرتے۔ ان قابل قدر ہستیوں میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی، شمس العماء مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، مفتی عبداللہ ٹونکی، شمس العلما مولوی عبدالحکیم اور ارشد گورگانی وغیرہ شامل ہیں۔ علامہ اقبال نے نالہ یتیم کے عنوان سے نہایت سوز و گداز کے ساتھ نظم پڑھی۔ جب شاعر نے یتیموں کی بے کسی کی حالت کا نقشہ کھینچا تو عام آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور ہر شخص دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اس نظم کا ایسا فوری اثر ہوا کہ اس کے پڑھنے کے دوران تین سو روپے سے کچھ اوپر نقد چندہ جمع ہو گیا اور کل کاپیاں نظم کی فروخت ہو گئیں۔ بانگ درا کے دیباچے میں علامہ اقبال کی نظم گوئی کے متعلق لکھا ہے:۔

”اول اول جو نظمیں جلسہ عام میں پڑھی جاتی تھیں وہ تحت اللفظ میں پڑھی جاتی تھیں اور اس طرز میں بھی ایک خاص لطف تھا مگر جب دوستوں نے ایک مرتبہ جلسہ عام میں شیخ محمد اقبال سے اصرار کیا کہ وہ نظم ترنم سے

پڑھیں۔ اُن کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آہنگ ہے طرز ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے۔اس کشش کے باعث عوام بھی کھینچ آئے۔لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہوجاتے ہیں اور جب تک نظم نہ ختم ہوجائے لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو''۔

علامہ اقبال نے انجمن کے جلسوں میں نظمیں پڑھنے کی ابتداء ۱۹۰۰ء میں کی اور سب سے پہلے ''نالہ یتیم''،نظم پڑھی۔۱۹۰۱ء میں یتیم کا خواب،۱۹۰۲ء میں ہلال عید اس طرح ۱۹۰۳ء میں ابر گوہر بار جو فریاد امت کے نام سے مشہور ہوئی اور ۱۹۰۴ء میں تصویر درد۔انجمن حمایت اسلام کا سولہواں جلسہ شیخ انعام علی بی اے سیالکوٹ کی صدارت میں منعقد ہوا جو ۲۲ تا ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء تک جاری رہا۔۲۴ فروری ۱۹۰۱ء کے دوسرے اجلاس میں علامہ اقبال نے نظم ''درد دل'' پڑھی۔

علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سترھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۱ تا ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کی ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کی دوسری نشست میں اپنی نظم خیر مقدم پڑھی اور خراج تحسین حاصل کیا۔اس نشست کی صدارت خان بہادر محمد برکت علی خاں نے فرمائی۔انجمن حمایت اسلام لاہور کے اٹھارویں جلسے کے تیسرے اکلاس میں جو جناب خاں بہادر غلام احمد خاں صاحب مشیر مال ریاست جموں وکشمیر کی صدارت میں ہوا۔علامہ اقبال نے شرکت فرمائی ''فریاد امت''، نظم پڑھی۔انجمن حمایت اسلام کی

روداد میں لکھا ہے:۔

"شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے کی نظم اچھی ہوگی جو ہمیشہ ہوتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں ان لائق لیکچراروں اور شاعروں کی داد میں نہ صرف جزاک اللہ کہنے پر اکتفا کیا جاوے گا بلکہ ان کی عملی طور پر قدر بھی کی جاوے گی"۔

انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ جلسے (یکم تا ۱۳ اپریل ۱۹۰۴ء) بروز ہفتہ کا جو اجلاس تھا خان بہادر مولوی شیخ انعام علی بی اے ڈویژنل جج ملتان کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں مولوی احمد دین اور خواجہ حسن نظامی صاحبان نے بھی شرکت فرمائی۔ علاوہ ازیں شیخ عبدالقادر اور علامہ محمد اقبال صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔ علامہ اقبال نے "تصویر درد" نظم سنی۔ اس نظم کے بارے میں میاں بشیر احمد اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں:

"مجھے خوب یاد ہے کہ پہلی نظم جو میں نے تصویر درد پڑھی۔ ایک حسین نوجوان، ناک پر عینک لگائے شلوار اور چاندنی جوتے پہنے۔ گریبان کا بٹن کھلا ہوا۔ اسٹیج پر کھڑا خوش الحانی سے ایک مخصوص لے میں پڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ایک شعر اس کا بکنے لگا۔ علامہ اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ ایک نوجوان نے پندرہ روپے میں ایک شعر خرید لیا معلوم ہوا کہ یہ گورنمنٹ کالج کا ہندو طالب علم ہے۔ یہ رقمیں انجمن کے چندہ میں جمع ہوئی تھیں"۔

ستمبر ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ اس

لیے ۱۹۰۵ء میں آپ نے کوئی نظم نہ پڑھی۔آپ تین سال یورپ میں مقیم رہے اور جولائی ۱۹۰۸ء میں وطن واپس لوٹے۔یورپ سے واپسی کے بعد انجمن کے تیسویں (۱۹۰۸) اور چوبیسویں (۱۹۰۹) کے جلسوں میں کوئی نظم نہیں پڑھی بلکہ انگریزی زبان میں لیکچر دیئے۔

اپریل ۱۹۱۱ء میں آپ نے اپنی مشہور ومعروف نظم ''شکوہ'' پڑھی اور زبردست خراج تحسین حاصل کیا۔اس سال انجمن کا سالانہ اجلاس ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا تھا۔جلسے کے لیے اسٹیج دائیں جانب کے پچھلے پلاٹ میں بنایا گیا تھا۔علامہ اقبال نظم پڑھنے کے لیے تشریف لائے۔آپ نے شلوار اور چھوٹا سوکوٹ زیب تن کیا ہوا تھا سر پر ترکی ٹوپی تھی۔

علامہ اقبال نظم پڑھنے کے لیے اٹھے تو مختلف سمتوں سے صدائیں بلند ہوئیں کہ نظم گا کر پڑھی جائے۔جب علامہ پڑھ رہے تھے ان پر پھول برسائے جا رہے تھے اس وقت کی ایک اور بات قابل دید تھی کہ علامہ کا معمر باپ اس نظم کے سننے والوں میں موجود تھا۔باپ کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خوشی کے آنسو تھے۔علامہ اقبال نے نظم کے علاوہ اصول تمدن پر ایک عالمانہ لیکچر بھی دیا جسے لوگوں نے بہت ہی توجہ اور خلوص دل سے سنا۔

انجمن حمایت اسلام کا ستائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء جو فقیر سید افتخار الدین سی۔آئی۔ای کی صدارت میں منعقد ہوا۔علامہ اقبال نے اپنی بے مثل اور بے عدیل نظم ''شمع و شاعر'' پڑھی۔اس وقت سامعین کی تعداد بلا مبالغہ کوئی دس ہزار کے لگ بھگ ہوگئی تھی۔علامہ اقبال نے جس وقت نظم ''شمع و شاعر'' پڑھنی

شروع کی تو اُس وقت حاضرین کی جو کیفیت تھی اُس کو لفظوں میں ادا کرنا مشکل ہے۔فی الحقیقت اس نظم کے پڑھتے وقت علامہ اقبال تو شاعری کی شمع بنے ہوئے تھے اور حاضرین کی وجدانی کیفیت کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جو اس مجمع میں اپنے پہلو میں دل رکھتے اور ذوق سلیم سے بہرہ ور تھے۔

علامہ اقبال نے انجمن کے پنتسویں سالانہ جلسہ کے جو ۴ اپریل ۱۹۲۰ء بروز اتوار بوقت آٹھ بجے صبح زیر صدارت نواب سر محمد ذوالفقار علی خاں صاحب صدر انجمن ہوا۔ اس میں ارتقاء اور مرد ''آزاد'' کے عنوان سے نظمیں پڑھیں۔

علامہ اقبال کی طویل نظموں میں ''خضر راہ'' کو جو انفرادیت حاصل ہے۔آپ نے یہ نظم انجمن کے ۳۷ سالانہ جلسے منعقدہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء میں پڑھی۔اس زمانے میں علامہ اقبال انجمن مذکور کے سیکرٹری تھے چنانچہ اس جلسے کا پروگرام آپ کی طرف سے اشاعت کے لیے اخبارات کو بھیجا گیا۔علامہ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی نے بیر سٹر ایٹ لا نے ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء اتوار کی شام آٹھ بجے بعد نماز مغرب ایک نظم پڑھی اس نظم نے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کو بلکہ تمام سامعین کو بے اختیار رلا یا۔اس نظم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ نے یہ نظم چھپوا کر نہ قلمی لکھ کر پڑھی بلکہ زبانی سنائی۔ پیسہ اخبار، ۱۸ اپریل ۱۹۲۲ء۔

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی ''خضر راہ'' کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

''۱۹۲۲ء میں علامہ اقبال نے اپنی تازہ نظم ''خضر راہ'' سنائی۔اُس وقت کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے جس دردانگیز طرز سے اقبال نے یہ نظم پڑھی اور جو کیفیت ومحویت حاضرین پر طاری ہوئی اس کا اندازہ کرنا

دشوار ہے۔ جب علامہ نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے اور سب کو بے چین کر دیا"۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دین مصطفیٰ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رو رہے تھے۔

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

انجمن حمایت اسلام کا اڑتیسواں سالانہ جلسہ ۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو اپنی سابقہ شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا علامہ اقبال نے اس جلسہ کے آخری اجلاس میں شرکت فرمائی اور اپنی مشہور نظم "طلوع اسلام" پڑھی ہفت روزہ اخبار لکھا ہے۔ یہ آخری اجلاس علامہ سر محمد اقبال کی نظم کے لیے مخصوص تھا تلاوت قرآن پاک کے بعد علامہ موصوف نے اپنی نظم "طلوع اسلام" کو اپنے دلاویز اور پُر درد لہجے میں پڑھا۔

انجمن حمایت اسلام کا ۵۱ سالانہ جلسہ (۱۰ تا ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء بروز جمعہ تا اتوار) کی صدارت جناب محمد شاہ نواز خاں صاحب نے فرمائی۔ اس اجلاس میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے علاوہ علامہ ابوالنصر سید مبشر الطرازی ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور حفیظ جالندھری نے شرکت فرمائی۔ اس اجلاس میں علامہ اقبال نے اپنی ایک تازہ ترین نظم بعنوان "نغمہ سرمدی" پڑھی۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ایک عرصہ کے بعد علامہ کا تازہ کلام انجمن کے اسٹیج پر پڑھا گیا اور علامہ اس اجلاس میں رونق افروز تھے۔ جلسے کی کامیابی پر روزنامہ انقلاب نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:۔

''اس سال انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس اللہ کے فضل اور کارکنوں کی ہمت کے باعث کامیاب رہا۔ پنڈال کی وسعت سال گزشتہ کی نسبت دوگنی سے بھی زیادہ تھی خواتین کے بیٹھنے کا بھی انتظام تھا۔ پروگرام بہت اچھا تھا کیونکہ اس میں حضرت اقبال، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحق، حفیظ جالندھری، پروفیسر ہادی حسن، مولانا احمد علی اور متعدد بزرگان ملت نے شرکت فرمائی۔۔۔۔۔ہم اس جلسے کی کامیابی پر حضرت علامہ اقبال، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، شیخ عظیم اللہ اور دوسرے مخلص کارکنان انجمن کو تعریف کا حق دار سمجھتے ہیں''۔

انجمن حمایت اسلام میں اقبال کی خدمات

۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی اسی زمانے میں علامہ اقبال نے انجمن کی سیکرٹری شپ کی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ یہ بڑا نازک دور تھا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو نواب ذوالفقار علی خاں صدر انجمن کی صدارت میں انہی کی کوٹھی پر جنرل کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں بڑے خاں بہادر، آنریبل اور سر جمع تھے۔ اس اجلاس میں ترک موالات پر بحث وتمحیص ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس امر کی تائید کی کہ گذشتہ اجلاس میں الحاق برقرار رکھنے کے متعلق جس طریق سے رائیں لی گئیں وہ طریقہ قطعاً غیر آئینی تھا۔ اسی اجلاس میں پروفیسر ہنری مارٹن پرنسپل اسلامیہ کالج معزول کیے گئے اور پروفیسر حاکم علی موقوف کیے گئے۔ کیوں کہ انہوں نے بعض بے ہودہ تحریریں اور فتویٰ شائع کر کے انجمن کے قواعد کی خلاف ورزی کی تھی۔

چونکہ مسلمان ترک موالات کے حامی تھے اور علمائے کرام اس کے متعلق فتویٰ

دے چکے تھے کہ حکومت سے اشتراک عمل قطعاً حرام ہے۔اور جمعیت علمائے ہند کی قرارداد یہ تھی کہ جب طلبا نے ترک مولات کے تحت مدارس چھوڑ دیئے ہیں اور اسلامی احکام کی پابندی کی ہے۔ان حالات میں کالج کھولنا سخت غلطی ہوگئی۔ڈاکٹر کچلو کا خیال تھا کہ کالج بند رہنا چاہیے۔چونکہ مذہبی حکم ہے کہ مسلمانوں کو اپنے کالجوں کا الحاق سرکاری یونیورسٹیوں سے قطع کرلینا چاہیے اس لیے فی الحال کالج کو بند رکھیے۔مناسب ہے کہ جب تک الحاق کے متعلق فیصلہ نہ ہوجائے کالج نہ کھولا جائے۔علامہ اقبال نے ایک پرجوش اور مدلل تقریر میں فرمایا:۔

''میں ہمیشہ ہر معاملے کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں اور جب تک کسی امر پر پورا پورا غور نہیں کر لیتا قطعی فیصلہ قائم نہیں کرتا۔میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ آج شریعت کے احکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں اُن کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے بالکل تباہ ہوجائے گی۔''

روزنامہ زمیندار کے نام اقبال کا ترک موالات اور اسلامیہ کالج کے یونیورسٹی سے الحاق کے بارے میں خط مخدومی جناب ایڈیٹر صاحب روزنامہ زمیندار۔السلام علیکم! آج کے ''زمیندار'' میں جنرل کونسل حمایت اسلام لاہور کے جلسہ منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۰ء کی کاروائی پر آپ نے جو لکھا ہے اس میں ایک آدھ فروگذاشت ہوگئی ہے۔جس کا ازالہ عام مسلمانوں کی آگاہی کے لیے بے حد ضروری ہے۔لہٰذا چند سطور لکھتا ہوں مہربانی کرکے اپنے اخبار میں درج فرمائیں۔

اراکین کونسل کے سامنے تین تجاویز تھیں :۔ا۔اسلامیہ کالج لاہور کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے جاری رکھا جائے۔محرک فضل حسین صاحب،سیکرٹری کالج،

مولوی فضل الدین وائس پریذیڈنٹ انجمن ۔۲۔انجمن حمایت اسلام لاہور اپنے طور پر علماء پنجاب و ہندوستان کی ایک کانفرنس کرے جس میں حالات حاضرہ سے واقف کار لوگ بطور مشیر کام کریں۔تاکہ علماء مسائل و متنازعہ فیہ کے ہر پہلو پر پوری بحث و تحصیص کے بعد نتائج پر پہنچیں۔علماء کی اس بحث میں مشیروں کو رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا اور فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا۔۳۔جمعیت علماء کا اجلاس دہلی میں عنقریب ہونے والا ہیان کے فتوے کا انتظار کیا جائے اور چند حضرات انجمن کی طرف سے بطور وفد اس جلسے کی بحث و مباحثے میں شریک ہوں محرک ڈاکٹر کچلو۔

پہلی تجویز میں قطعاً کوئی مباحثہ نہیں ہوا نہ مذہبی نقطہ خیال سے نہ تعلیمی نقطہ نگاہ سے۔اس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اگر ارکان کونسل مذہبی نقطہ نگاہ سے اس تجویز پر مباحثہ نہیں کر سکتے تو تعلیمی نقطہ نگاہ سے اس پر معقول و مدلل بحث ہوسکتی ہے۔عدم تعاون یا ترک موالات سے قطع نظر کر کے بھی تعلیم کو نیشلائز کرنے کے دلائل دیئے جاسکتے ہیں۔مولوی غلام محی الدین صاحب نے بھی جلسہ سے بحث کی اجازات چاہی افسوسہے کہ اجازات نہ ملی۔اصل بات یہ ہے کہ میاں صاحب کی تجویز کے فوراً بعد دوسری اور تیسری تجاویز پیش کی گئیں اور بحث انہی تجاویز پر ہوتی رہی۔بہرحال تجویز اول پر ووٹ لیے گئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کثرت آراء میاں سر فضل حسین کی تجویز کے حق میں تھی۔۲۱ ممبروں میں جن میں مولوی عبد القادر صاحب قصوری، حاجی شمس الدین صاحب اور خاکسار شامل تھے ووٹ دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ان ممبروں کی رائے میں معامہ زیر بحث ایک نہایت اہم مذہبی پہلو ہے۔جس کا فیصلہ علماء سے استفسار کیے بغیر ایک ایسی انجمن کے لیے ناممکن ہے جو انجمن حمایت اسلام کے

نام سے موسوم ہو۔ پہلی تجویز کے فیصلہ ہو جانے پر باقی دو تجاویز پر ووٹ لینا ضروری نہ سمجھا گیا۔ میری رائے یہ تھی کہ مولوی ابراہیم کی تجویز کے مطابق انجمن خود علماء کی کانفرنس مدعو کرے تا کہ اس نازک مسئلے کے ہر پہلو پر پوری بحث ہو سکے جو فتوے دفتر انجمن موصول ہوئے ہیں۔ اُن کو علما حضرات سے فرداً فرداً حاصل کیا گیا ہے اور بعض ضروری سوالات اُن سے پوچھے ہی نہیں گئے۔ مثلاً حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کے فتویٰ میں الحاق کے متعلق کوئی سوال نہیں پوچھا گیا۔ اس طرح مولوی اشرف علی تھانوی کی خانقاہ کا فتویٰ یا ترک موالات کے مسئلے پر ایک عام بحث ہے جس میں استفسار بھی درج نہیں علیٰ ہذا القیاس علمائے سندھ کے فتوے میں زرِ امداد یا الحاق کے متعلق کوئی سوال حضرت علماء سے نہیں کیا گیا۔ کفار سے ترک موالات مسلمانوں کے لیے کو یہ نیا حکم نہیں اور اس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا ہاں اس کے مدارج اور جزئیات مختلف ہیں۔

کفار محارب ہوں تو ان کے لیے اور احکام ہیں غیر محارب ہوں تو ان کے لیے اور احکام ہیں۔ اس فرق کو کسی فتوے میں نمایاں نہیں کیا گیا جس سے میرے خیال میں سخت غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ مثلاً آج شام میں نے ایک دوست سے سنا ہے کہ پروفیسر حاکم علی صاحب اسلامیہ کالج نے اپنے فتوے کی تصدیق میں مولوی احمد رضا صاحب بریلوی سے ایک فتویٰ حاصل کیا ہے۔ پروفیسر صاحب خود بریلی تشریف لے گئے لاہور واپس آنے پر انہوں نے مولوی اصغر علی روحی سے استدعا کی کہ وہ مولوی احمد رضا صاحب کے فتوے پر دستخط کریں۔ کیونکہ حضرت دیوبند مولوی اشرف علی صاحب نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ حاکم علی صاحب انریبل میاں فضل حق سے

ایک دستی خط لے کر مولوی احمد رضا صاحب کی خدمت میں پہنچے اوران سے التماس کی کہ میاں صاحب فرماتے ہیں کہ علمائے دیوبند وغیرہ۔ پر جو لے دے آپ نے اس فتوے پر کی ہے اسے نکال ڈالیے لیکن مولوی صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اورمیاں صاحب کے خط کے جواب میں کہا میرے دوست نے یہ فتویٰ خود پڑھا ہے اورمولوی احمد رضا کا وہ خط بھی دیکھا ہے جو مولوی صاحب موصوف نے میاں صاحب کے جواب میں لکھا ہے۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ آیا اس فتوے میں محارب و غیر محارب کفار کا امتیاز کیا گیا تھا انہوں نے جواب دیا کہ نہیں اس سے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جب تک ضروری سوالات نہ کیے جائیں تو کیا قصور مفتی صاحب کا ہے؟ اس امتیاز کے علاوہ بعض نہایت اہم اقتصادی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا پوچھنا مفتی سے ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کے لیے ایک پورا نظام عمل مرتب ہو۔ غرض یہ کہ جس طرح مفتی کے لیے علم وتقویٰ کی شرائط ضروری ہیں اس طرح مفتی کے علم سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسائل نکتہ رس، معاملہ فہم اور زیرک ہو۔ بالخصوص ایسے معاملے میں جس کا اثر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر پڑتا ہو۔

اس وقت مسلمانوں کی بدنصیبی سے اس ملک میں اسلامی ممالک میں کوئی واجب اطاعتہ موجود نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا تھا کہ واجب الطاعتہ امام نہ ہونے کی صورت میں خلافت کمیٹی کا فتویٰ واجب الطاعتہ ہے۔ میں نے اُن کے دلائل نہیں سنے اس وقت تک مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے دلائل سننے کے بعد میری رائے بدل جائے۔ فی الحال تو میرے نزدیک ہی راہ کھلی ہے اور یہی راہ

شریعت کی رو سے بھی درست ہے کہ علما ایک جگہ جمع ہو کر ہر قسم کا اعتراض سننے اور پورے بحث ومباحثہ کے بعد مسلمانوں کے لیے ترک موالات کا ایک پروگرام مرتب کریں۔اس جمعیت میں حضرات مشائخ بڑے بڑے حنفی راہنما اور اگر ضروری ہو تو شعیہ اور اہل حدیث علماء بھی جن کے علم اور تقویٰ پر قوم کو اعتماد ہو طلب کیے جائیں۔میرے خیال میں ایسے حضرات کا انتخاب کوئی مشکل امر نہیں۔مسلمان وکلاء بھی اس بحث میں شریک ہو کر کم از کم سائل کی حیثیت سے مدد دیں۔علماء کے لیے بھی یہ ایک نادر موقع ہے کہ وہ آپس کے اختلافات کو رفع کر کے اُمت مرحومہ پر اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کر لیں خدا تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ بھٹکا ہوا آہو پھر خود بخود حرم کی طرف آ رہا ہے۔

ایسے حالات قوم کی زندگی میں شاذ ہی پیدا ہوا کرتے ہیں اگر ان حالات سے حضرات مشائخ علماء نے فائدہ نہ اٹھایا اور مسلمانوں کی راہنمائی کر کے ان کو اپنے بچھڑے ہوئے محبوب یعنی شریعت اسلامیہ سے نہ ملا دیا تو اس ملک میں مسلمانوں کا بحیثیت ایک مذہبی جماعت کے خاتمہ تصور کرنا چاہیے۔اور مسلمانان ہند کی اس ہلاکت کے لیے قیامت کے دن نبی کریم ﷺ کے سامنے جواب دہ ہوں گئے اگر اس کانفرنس میں علماء کے انتخاب اور اس کے مجموعی عمل میں دیانت وامانت سے کام کیا گیا تو مسلمانان ہند کی زندگی میں وہ عظیم اخلاقی اور روحانی انقلاب پیدا ہو گا جس کے لیے شاہ ولی اللہ کی روح تڑپتی تھی۔

میں جانتا ہوں کہ اس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے وقت اور روپیہ کی ضرورت ہے۔مسلمانان ہند سے میری التماس ہے کہ اس کام کو بخدا اپنے ذمہ لیں اور لاہور یا

باہر کے مسلمانوں میں سے کوئی اللہ کا بندہ اور عاشق ایسا نکلے کہ اس کانفرنس کا خرچہ اپنے ذمہ لے لے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس پر فلاح و برکت کے دروازے کھول دے گا اور آخرت میں اس کی بارگاہ میں باریاب ہوگا۔

فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ بعض ناظرین کے دل میں یہ خیال گزرے کہ جب جمعیت علماء کا جلسہ دہلی میں عنقریب ہونے والا ہو تو ایسی کانفرنس قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر کچلو کی تجویز میں سر دست کسی خرچ اور وقت کی ضرورت نہیں لیکن جب جنرل کونسل میں ان تجاویز پر بحث ہو رہی تھی تو بعض صاحبان کی گفتگو سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ دہلی کی کانفرنس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہ یہ کانفرنس ایک خاص خیال کے علماء کا مجموعہ ہوگی۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ اس وقت جو معاملات زیر بحث ہیں محض سیاسی ہیں وہ جمعیت اسلامیہ کی ہیئت اور اُس کے مقاصد سے بالکل بے خبر ہیں۔ اسلام کے نزدیک مسلمانوں کا کوئی فعل انفرادی ہو یا اجتماعی مذہب کی ہمہ گیری سے آزاد نہیں اور برخلاف دیگر مذاہب کے اسلام نے ہر پہلو کے لیے احکام وضع کیے ہیں۔ وہ مذہب جو اپنے احکام میں تمام ضروریات انسانی کو ملحوظ نہیں رکھتا ایک قسم کی ناقص رہبانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مغربی خیالات ایک نامحسوس زہر کی طرح ہمارے دماغوں میں سرایت کر گئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مذہب کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں اکثر تعلیم یافتہ نوجوان بے تحاشا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ اور قوم کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں اُن کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ یہ خیال کم از کم اسلام کے لیے زہر قاتل ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود یورپ کے حکماء جو اس

خیال کے حامی ہیں جن سے ہمارے نوجوانوں نے یہ سبق سیکھا ہے اب اس ہیبت ناک جنگ کے بعد جو اسی شیطانی اُصول کا نتیجہ تھی اس خیال کی صحت میں مستعمل نظر آتے ہیں۔افسوس ہے کہ اراکین حمایت اسلام نے بھی زیر بحث معاملات کے فیصلے میں اسی اصول پر عمل کیا ہے مجھے اُن سے شکایت ہے کہ انہوں نے کیوں فیصلہ کرنے میں پیشتر فقہائے سے استصواب نہیں کیا۔اگر تمام حالات کو سننے کے بعد فقہائے اسلام کی یہی رائے ہو کہ الحاق قائم رکھا جائے تو میں بھی نہایت خوشی کے ساتھ اراکین انجمن کا ہم نوا ہوں قطع نظر اس کے انہوں نے اپنا ایک مذہبی فرض ادا نہیں کیا میری رائے ناقص میں اس سوال کے مذہبی پہلو کو نظر انداز کرنے سے اراکین کونسل نے خود انجمن کے لیے ایک زندگی و موت کا سوال پیدا کر دیا ہے۔میں نے آپ کے اخبار کی بہت جگہ لے لی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ فراخ دلی سے مجھے معاف فرمائیں گئے۔آپ کا مخلص۔۔۔علامہ صاحب۔

انسان کو مشاہدے اور تجربہ کے ذریعے سے علم حاصل کرنے کی تلقین فرمائی کی گئی ہے اور منتہائے نظر یہ یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے۔چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے آگے بھی پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔مسلمانوں میں مختلف فرقوں کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہوتا ہے وہ اس قسم کا نہ تھا جو یورپ کے روشن دماغ علماء اور تاریک خیال پادریوں کے درمیان پیدا ہوا بلکہ وہ تو ایک علمی بحث تھی جس کا موضوع محض یہ تھا کہ آیا ہمیں الہامی کلام ربانی کو عقل انسانی کے معیار پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

مقالہ سپرٹ آف مسلم کلچر:

انجمن حمایت اسلام لاہور ۴۲ ویں سالانہ جلسے کا انعقاد ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء بروز شنبہ جناب صلاح الدین خدا بخش صاحب ایم۔اے کلکتہ کی صدارت میں ہوا۔اس اجلاس میں علامہ اقبال نے بھی شرکت فرمائی۔آپ نے ''دی سپرٹ آف مسلم کلچر'' یعنی روح تہذیب اسلامی کے موضوع پر انگریزی زبان میں بے نظیر، فاضلانہ خطبہ ارشاد فرمایا۔علامہ اقبال نے حیرت انگیز نکات پیدا کیے اور انتہائی کوشش کی کہ تمام لوگ اسے سمجھ جائیں۔مگر حاضرین کے اصرار پر آپ نے اُردو زبان میں خطبہ کا خلاصہ پیش کیا۔فرمایا:۔

> ''ہر انسان کی خواہش ہے کہ اُسے نظام عالم سے آگاہی حاصل ہو۔زمان ومکان کی ہر شے سمجھ میں آجائے جو کائنات کے اندر پوشیدہ ہے اس کے مشاہدے کا نظارہ مل سکے۔وہ اپنی ساری قوتیں اس پر صرف کرتا ہے دنیا کی ساری قومیں اس مشاہدے کے لیے ہمیشہ بے تابی کا اظہار کرتی رہی ہیں۔''
>
> مشاہدہ حقیقت کے دو اصول ہیں:
>
> (۱) سمع و بصر (۲) قلوب یہ بہ اصلاح حکیم انند

یہ ضروری نہیں ان دو طریقوں سے بقدر ضرورت کام لیا جائے یورپ نے اپنی ساری کوششیں صرف سمع و بصر تک محدود کر دیں اور ''انند'' کو ترک کر دیا۔مسلمانوں نے اپنی توجہات انند پر مرتکز کر دیں اور سمع و بصر سے پورا کام نہ لیا بلکہ ایشیائی تہذیب کا خاصا یہی ہے کہ اس میں انند پر بہت زور دیا گیا ہے اور سمع و بصر کی بالکل پرواہ نہیں

کی گئی حالانکہ ضرورت دونوں طریقوں سے کام لینے کی ہے۔نظام عالم کی آفرینش کو یوں سمجھ کر حقیقت نے اپنی نمود یا اپنے آپ کو واضح کرنے کے لیے ایک نکتہ خاص سے سفر کیا یا بہ اصلاح صوفیہ کرام جنہوں نے نظارے کے شوق میں اپنے آپ کو آشکارا کردیا۔اس خط سفر کا آخری نکتہ عالم ظاہر ہے اب حقیقت تک پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ اس نقطہ سے الٹا سفر کیا جائے۔مشاہدے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان اس میں اپنے آپ کو فنا کردے۔اسلام اپنے آپ کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے اسلام کا مشاہدہ مردانگی پر مبنی ہے۔علامہ ممدوح نے اپنے خطبہ کے درج ذیل نکات بیان کیے ہیں:۔

(ا) آنحضرت ختم الرسول ہیں نبی اس لیے بھیجے گئے کہ وہ لوگ جن کی سمجھ ابتدائی حالت میں تھی سمجھائیں عین اُس وقت دنیا میں غور وفکر کا شور شروع ہوا۔اور لوگ تقلید سے نہیں بلکہ اپنے علم وفہم ادراک کی مدد سے نتائج اخذ کرنے لگے گویا تقلید جامد کی جگہ افق عالم پر علم وادراک کا آفتاب طلوع ہوا۔اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے آخری حجت کو ارسال کردیا اور کہہ دیا کہ اب کوئی ایسا شخص نہیں آسکتا جس کی باتوں کو تم تنقید کے بغیر تسلیم کرو۔شہنشاہیت اور نبوت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور دماغی غلامی پر موت چھا گئی۔عقل کے عروج کی ابتداء وہ روز سعید ہے جب ختم رسل ﷺ معبوث ہوئے اب اگر کوئی شخص نبوت کا مدعی ہو تو ہم اُس کی دماغی حالت کا اسی طرح مطالعہ کریں گا۔ جس طرح علم حیات کا ماہر کسی مینڈک کا مطالعہ کرتا ہے اور کیکڑے کے وجود پر غور وفکر کی نگاہ ڈالتا ہے۔

(۲) یورپ کی ترقی اس سے شروع ہوئی کہ اہل مغرب نے فلاسفہ یونان کے فلسفہ کے خلاف جو تقویم پارینہ ہو چکا تھا علم جہاد بلند کیا استقرائی منطق پر زور

دیا۔موشگافی کے بجائے مشاہدات وتجربات حصول علم کا ذریعہ قرار دیئے گئے لیکن جاننے والے جانتے ہیں استقرائی منطق کا موجد اور مدون اول یعقوب کندی ہے بیکن نہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ بیکن نے جو عربی پڑھا ہوا تھا اندلس کے عرب منطقیوں کی تصنیفات سے حظ وافر حاصل کیا اور اُن کے خیالات کا ترجمہ کیا۔

(۳) ہندی حکماء اور یونانی طلباء کے نزدیک یہ دنیا ایک مکمل نظام کی شان رکھتی ہے مگر امام غزالی اور امام ابن تیمیہ جیسے اکابر اسلام نے اس واہمہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔انہوں نے قرآن کریم کی آیات سے متاثر ہو کر دنیا کی عدم تکمیل کا دعویٰ کیا اور ثابت کیا کہ دنیا ابھی منازل ارتقاء طے کر رہی ہے۔

(۴) فلسفہ یونان کے خلاف جہاد کرنے کا ڈھنگ یورپ کے ارباب فکر نے مسلمان حکماء سے سیکھا امام غزالی سے فلسفہ یونان کے پرخچے اڑا دیئے۔ابن رشد نے فلسفہ کی قبائے دریدہ کو رفو کرنا چاہا مگر وہ اس مقصد میں ناکام رہا۔

(۵) ذوالنون مصری بہت بڑے صوفی ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے کیمیا دان بھی تھے چنانچہ وہ حکیم جس نے سب سے پہلے دریافت کیا کہ پانی جوہر بسیط ہی نہیں آپ ہی ہیں۔

(۶) اٹلی کے مشہور شاعر دانتے نے اپنی شہرہ آفاق نظم میں بہشت بریں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ تمام وکمال محی دین ابن عربی کی فتوحات سے ماخوذ ہے اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کے فلسفہ پر ہی نہیں بلکہ ادب پر بھی زبردست اثر ڈالا ہے۔

لیکچر بعنوان فلسفہ اقبال:

انجمن حمایت اسلام کے ۴۷ سالانہ جلسے (۶ اپریل تا ۷ اپریل ۱۹۲۸ء) میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے نہ صرف ایک لیکچر بعنوان ''فلسفہ اسلام'' دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور اس امر کی اطلاع سیکرٹری انجمن کو دے دی تھی لیکن اخبارات میں جب پروگرام شائع ہوا تو ڈاکٹر صاحب کا نام ایک کے بجائے دو جگہ درج تھا۔ جب انہوں نے اپنا پروگرام چھپا ہوا دیکھا تو افسوس ہوا بہر حال علامہ اقبال نے مورخہ ۸ اپریل کو شام ساڑھے آٹھ بجے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر اسلامیہ کالج کے میدان میں انجمن کے پنڈال میں انگریزی زبان میں خطبہ دیا۔

علامہ اقبال نے اپنا انگریزی لیکچر فلسفہ اسلام پڑھ کر سنایا ڈاکٹر صاحب موصوف نے مدارس کی ایک سوسائٹی کے لیے فلسفہ اسلام پر لیکچروں کا ایک سلسلہ لکھ رہے تھے یہ لیکچر اسی سلسلے کی ایک بہت بڑی کڑی تھے۔ آپ کا لیکچر فلسفہ کے نہایت دقیق اور پیچیدہ مسائل پر مبنی تھا جس میں آپ نے ثابت کیا تھا کہ بخلاف دیگر ممالک ہائے فلسفہ کے اسلام کا فلسفہ نظریہ اور عمل دونوں پر حاوی ہے اور وہ دنیا کے نظام فلسفہ سے اوج وفوقیت رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ امام غزالی اور رازی نے اپنے وقت کے لحاظ سے جو خدمت فلسفہ اسلام کی کی۔ اس نوع کی خدمت موجودہ زمانے کے اعتبار سے وہ بھی انجام دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بحیثیت صدر علامہ اقبال کی انجمن کے اجلاس میں تقریر

۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء بروز ہفتہ ساڑھے پانچ بجے شام علامہ اقبال کی صدارت میں

اجلاس ہوا۔ آپ نے چند اہم اور فوری نوعیت کے مسائل کی طرف توجہ دلائی۔

ا۔ دینیات کی تعلیم:

تجربہ بتاتا ہے کہ جدید تعلیم نے مسلمان نوجوانوں کے اخلاق زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں کیا اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک مسلمان نوجوان ک تعلیم کی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو اس میں سیر چشمی، بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصاف حسنہ پیدا نہیں ہو سکتے جو اسلامی سیرت کے لیے اہم ہیں۔

(۲) دوسرا مسئلہ جو فوری توجہ کا محتاج ہے وہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے انجمن نے آج تک اس ضروری مسئلے کی طرف کوئی خاص نہیں کی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ اب کافی بیدار ہو چکا ہے اور اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ ان کی اولاد کی صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق تعلیم و تربیت کی جائے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام فی الحال مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اپنا نصاب تجویز کرے۔ اور مجوزہ نصاب کے مطابق اُن کا سالانہ امتحان لے کر خود ہی اسناد تقسیم کیا کرے۔

(۳) تیسرا امر جو آپ کی توجہ کا محتاج ہے اسلامیہ کالج کی موجودہ حالت ہے۔ ہندوستان سے کسی مسلمان پرنسپل کا ملنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ ہم کو ایسے پرنسپل کی ضرورت ہے جو علم و فضل کے علاوہ صاحب اثر و رسوخ ہو مسلمانوں کی آرزوؤں سے ہمدردی رکھتا ہو اور ہمارے بچوں کی اُن تمام امور میں تربیت کر سکتا ہو۔ جو ملک کے آئندہ سیاسی تغیرات کی وجہ سے قومی زندگی کے لیے اب بے انتہا ضروری ہے اگر مسلمانان ہند میں کوئی ایسی شخصیت مل سکتی ہے تو اس سے بڑھ کر اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے؟

انجمن کی مالی مشکلات کے بارے میں اجلاس:

۳۰ اگست ۱۹۳۴ء (بروز جمعرات ساڑھے پانچ بجے) دفتر انجمن حمایت اسلام میں علامہ محمد اقبال صاحب صدر انجمن کی صدارت میں جنرل کونسل کا ایک اجلاس ہوا۔ آنریری سیکرٹری فنانس ۳۵۔۱۹۳۴ء کے آمدن وخرچ کا بجٹ پیش کیا جس پر سید حبیب صاحب نے کہا کہ صاحب صدر کی ذات گرامی سے ہمیں پوری توقع ہے کہ اگر صاحب صدر انجمن کی مالی مشکلات کی طرف توجہ دلائیں۔ صاحب صدر نے ارشاد فرمایا:۔

> ''یہ ہمارا قومی اور مذہبی فرض ہے کہ ہم سب متحد ہو کر انجمن حمایت اسلام کی مالی حالت کے اضافے میں کوشش کریں۔ میں اُمید کرتا ہوں اگر آپ سب صاحبان میرے ساتھ اس معاملہ میں تعاون کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا فرمائے گا۔ حاضرین نے لبیک کہا۔''

فلسفیانہ خطبہ قرآن کا مطالعہ:

انجمن حمایت اسلام کا چوالیسواں سالانہ اجلاس (۱۲ تا ۱۴ اپریل ۱۹۲۹ء) منعقد ہوا۔ ۱۴ اپریل والے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر صاحب سر میاں محمد شفیع نے فرمائی علامہ اقبال ابھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ آپ نے قرآن کا مطالعہ کے عنوان سے ایک محققانہ اور فلسفیانہ خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا کے ہر سوچنے سمجھنے اور پرکھنے والے مسلمان کو اس بات پر یقین ہے کہ فہم وعمل قرآن سے مسلمانوں کی بے رغبتی ہی حقیقت میں دنیائے اسلام کے تنزل کا باعث ہے اور یہی وہ چیز ہے جو آئندہ دنیا میں

فرزندانِ اسلام کو ابھار سکتی ہے۔قرآن کے مطالعہ کی اہمیت کا صحیح احساس اُس وقت ہوسکتا ہے جب ہم قرآن پاک کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ ہو جائیں۔

مذہب اور سائنس پر مقالہ:

۴ مارچ ۱۹۲۷ء اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مرزا بشیر الدین محمود نے مذہب اور سائنس کے موضوع پر تقریر کی جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔اس موقع پر آپ نے فرمایا مذہب فلسفہ طبیعات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات و قیاسیات پر پرکھنے کے طریق کو مسترد کر دینے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔

ڈاکٹر ولیم ڈریپر کی مشہور و معروف کتاب ''معرکہ مذہب و سائنس'' ترجمہ از مولانا ظفر علی خاں اصل میں مذہب اور سائنس کی ہنگامہ آرائی کی مظہر نہیں بلکہ عیسائیت اور سائنس کے تصادم کی تاریخ ہے۔اس تصادم کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے علماء و حکماء مسلمانوں کی علمی ترقی سے متاثر ہوئے تو اہل فرنگ کے خیال میں زبردست انقلاب پیدا ہونے لگا اور رومن کیتھولک مذہب والے اس علمی انقلاب سے متاثر ہوئے ڈاکٹر ڈریپر نے اسی انقلاب کی تاریخ لکھی۔

سائنس اور مذہب کے تصادم کا خیال غیر اسلامی ہے قرآن کریم کے ہر صفحہ پر انسان کو مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

میاں شفیع لائبریری کا قیام اور علامہ اقبال کا صدارت سے استعفیٰ:

میاں محمد شفیع لائبریری کے قیام اور انتظام و انصرام کے سلسلے میں جو کمیٹی قائم کی گئی تھی اس کے ایک رکن علامہ محمد اقبال بھی تھے۔ سب کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے ۴ جولائی ۱۹۳۷ء کو جنرل کونسل کا ایک اجلاس حاجی رحیم بخش ریٹائرسیشن جج کی صدارت میں منعقد ہوا اسی اجلاس میں علامہ اقبال کا استعفیٰ پیش کیا گیا جو انہوں نے اپنی طویل علالت کے پیش نظر دیا تھا۔ آپ نے لکھا:۔

جناب من!

میرا استعفیٰ ابھی تک جنرل کونسل میں پیش نہیں ہوا۔ ازراہ عنایت ۴ جولائی کی کونسل میں اسے ضرور پیش فرما کر منظور کرا دیں۔ میری طویل علالت مجھے مجبور کرتی ہے کہ ہر قسم کے فرائض سے سے خواہ کتنے ہی ہلکے کیوں نہ ہوں سبکدوش ہو جاؤں گا۔

والسلام

دستخط

یکم جولائی ۱۹۳۷ء

تھوڑی دیر کی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ گیارہ اصحاب پر مشتمل ایک وفد علامہ محمد اقبال کے پاس جائے اور اُن سے استعفیٰ پر غور کرنے کے بارے میں کہے چنانچہ ۲۱ جولائی ۱۹۳۷ء کو انجمن کے چند ممبروں پر مشتمل ایک وفد اُن سے ملا۔ آپ نے فرمایا جن وجوہ کی بنا پر دیگر حضرات انجمن سے مستعفی ہوئے ہیں۔ میرے استعفیٰ کی وہ وجوہ نہیں۔ اب سے چھ ماہ پیشتر ہی میں نے انجمن کو اپنا استعفیٰ بھیجا تھا مگر انجمن نے اُسے منظور نہ کیا۔ اب میری صحت مجھے ایسی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتی۔ ڈاکٹروں

نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ ذمہ داری کا بوجھ نہ اٹھاؤں حتی المقدس بدستور انجمن حمایت اسلام کی خدمت کرتا رہوں گا۔

قیام لاہور کے دوران سیاست میں حصہ:

علامہ اقبال کشمیری نژاد تھے سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد لاہور میں اُن کے شباب نے آنکھ کھولی۔اور پھر یہیں اُن کے افکار نے تدریجی منزلیں طے کیں۔اور مشرق و مغرب کی انسانیت اور ملت اسلامیہ کو پیام حیات دے کر اُسی شہر کی خاک میں ابدی نیند سو گئے اور مسجد شاہی کی سیڑھیوں کے پاس اُن کی تربت خاموش زائرین عالم کے لیے عزم و ہمت کا استعارہ بن چکی ہے۔سیالکوٹ کے بعد لاہور علامہ اقبال کے ماحول کا دائرہ ہے پھر پنجاب بھر جس کے ساتھ ہی شمال مغربی و ہند کا وہ حصہ بھی آجاتا ہے جو اُن کے خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء کا اہم موضوع تھا۔ اور جہاں آگے چل کر پاکستان کی تشکیل ہوئی۔ان سب دائروں میں مرکزی نقطہ لیکن بنیادی دائرہ لاہور جو کہ پنجاب کا دل تھا جس کی دھرتی پر کھڑے ہو کر علامہ اقبال اپنے نصب العین کا تانا بانا بن رہے تھے فکری محور سے قطع نظر یہ دور علامہ اقبال کی عملی سیاست میں شمولیت کا بھی ہے جس میں بنگال، سرحد، بلوچستان کی صورت میں ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بنی رہی۔

علامہ اقبال ۱۹۲۶ء میں لاہور کے مجلس مقنّنہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۲۹ء تک صوبائی مقنّنہ میں مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کرتے رہے اس کے علاوہ صوبائی مسلم لیگ پنجاب کے سیکرٹری اور پھر صدر کی حیثیت سے وہ اس دور کے اہم سیاسی، مذاکرات میں عملاً شرکت فرماتے رہے مثلاً سائمن کمیشن، نہرو پورٹ،

جناح مسلم لیگ، شفیع مسلم لیگ، آل پارٹیز مسلم کانفرنس، گول میز کانفرنس، تحریک کشمیر، مسجد شہید گنج کا واقع، کمیونل ایوارڈ اور انڈیا ایکٹ ۱۹۲۵ء مسلم لیگ کی تنظیم نو یہ سب وہ سیاسی امور ہیں جن میں علامہ اقبال کے فکر و عمل کا بھی بڑا حصہ ہے۔

لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہیں:

علامہ اقبال ۱۸۹۵ء میں لاہور تشریف لائے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کی کلاس میں داخل ہوئے۔ علامہ اقبال لاہور کے زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج کے اس ہوسٹل کے کمرہ نمبر ا میں مقیم رہے جو آج کل کواڈ رینگل کہلاتا ہے۔ ان کا کمرہ دوستوں کے جمگھٹوں اور شعر خوانیوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ اس کمرے کو اب تاریخی حیثیت دی گئی ہے اور اس کے اوپر رہائش گاہ علامہ اقبال کی تختی بھی منجانب آثار قدیمہ لاہور لگی ہوئی ہے۔

قیام بھاٹی دروازہ:

علامہ اقبال گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کو چھوڑ کر ۱۹۰۰ء کے فوراً بعد بھاٹی دروازہ کے اندر کرائے کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے تھے بھاٹی دروازے کی ادبی محفلوں نے علامہ اقبال کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے یہاں کئی مکان بدلے پہلا مکان جس میں وہ قیام پذیر ہوئے میاں احمد بخش کی ملکیت تھا اُس کے ایک طرف مولوی محمد باقر (پروفیسر فارسی) رہا کرتے تھے اور ذرا فاصلے پر آگے جا کر شمس العلماء مولوی محمد حسین (پروفیسر عربی) کی رہائش تھی۔ حاکم علی پروفیسر اسلامیہ کالج اور مفتی عبداللہ ٹونکی کا قیام بھی تھا۔ آج کل اس کا نمبر ۱۴۷ بی ہے۔ یہ مکان کوچہ جلوٹیاں کہلاتا

ہے۔چند ماہ کے بعد اس مکان کے قریب ہی مکان نمبر ۵۹۷ بی میں آ گئے۔ یہاں علامہ اقبال کا قیام انگلستان جانے تک رہا۔

چنگڑ محلّہ (موہن لال روڈ)

۲۷ اگست ۱۹۰۵ء علامہ اقبال ولایت تشریف لے گئے اور ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو واپسی ہوئی احباب کے مشورے سے وکالت کا پروگرام بنا تو موہن لال روڈ پر رہائش کا بندوبست کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۰۸ء تک علامہ اقبال کا قیام اسی عمارت میں رہا۔

قیام انارکلی:

اکتوبر ۱۹۰۸ء کو علامہ اقبال موہن لال روڈ (اردو بازار) والے مکان سے انار کلی والے مکان میں اُٹھ آئے اس سے قبل اس مکان میں میاں شفیع رہائش پذیر تھے۔نظم ''خضر راہ''، ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' بھی یہیں لکھیں گئیں۔ ''پیام مشرق'' کی پہلی اشاعت بھی اسی مکان میں ہوئی۔

قیام میکلور روڈ:

۱۹۲۲ء کے اواخر میں علامہ اقبال انار کلی والے مکان کو چھوڑ کر میکلور روڈ کی کوٹھی میں آ گئے یہیں آپ کو سر کا خطاب ملا۔کوٹھی کا نمبر ۳۴ ہے اب اسے حکومت پاکستان نے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں دے رکھا ہے تیرہ برس تک قیام اس کوٹھی میں رہا اور مئی ۱۹۳۵ میں اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہوئے۔ پیام مشرق کا دوسرا ایڈیشن اور بانگ درا کا پہلا ایڈیشن اس کوٹھی میں شائع ہوا۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل ۱۹۲۷ء اور رنگیلا رسول کے خلف جلسے اسی مکان میں رہائش کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔اس کوٹھی کے

قیام کے دوران آپ کابل گئے تھے۔۱۹۲۴ء میں دیو بند علمائے کرام کی کی شاندار دعوت بھی اسی مکان میں ہوئی تھی۔

جاوید منزل:

علامہ اقبال کا آخری قیام اُن کی ذاتی کوٹھی ''جاوید منزل'' میں تھا علامہ اقبال نے یہ زمین جاوید اقبال کے نام پر خریدی تھی اور بڑے شوق سے کوٹھی تیار کروائی۔۱۹۳۵ء میں آپ نے یہاں رہائش اختیار کی اسی کوٹھی میں والدہ جاوید کا انتقال ہوا۔اسی کوٹھی میں آپ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کواس دار فانی سے کوچ کیا۔

اقبال، لاہور اور احباب

لاہور ہمیشہ سے علم وادب کا مرکز رہا ہے۔دلی، لکھنو اور حیدر آباد کی طرح یہاں بھی فارسی اور قدیم اُردو ادب کے ایسے مشاہیر گزرے ہیں، جنھوں نے ادب کو اپنے خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا اور ان کے کارہائے نمایاں سے ایک دنیا واقف ہے۔مگر انگریز کے آنے کے بعد برصغیر کی وہ تاریخ جو پرانے وقتوں سے چلی آرہی تھی، بدلنے لگی۔فکر واحساس کی نئی راہیں پیدا ہوئیں اور نئے تقاضوں کے پیش نظر ادب کے موضوعات اور اسالیب میں تبدیلیاں آنے لگیں جس کی بلند آہنگ بازگشت ہمیں ''انجمن پنجاب'' کی شکل میں سنائی دی۔یہ انجمن مشرق ومغرب کے تہذیبی رابطے کی علامت ہے۔ان تمام ادبی رویوں کو جو مغربی ادب سے مستعار ہیں اور جنھوں نے اردو شعر وادب میں تازہ لہو دوڑایا، سب سے پہلے خوش آمدید کہنے والی تحریک ''انجمن پنجاب'' ہے۔جس کی روحِ رواں آزاد اور حالی تھے۔انجمن پنجاب

کے بعد ادب کی بڑی بڑی تحریکیں چلیں، جن میں پنجاب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔علامہ اقبال ایسے دور میں پیدا ہوئے جو برعظیم کے مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی دورزوال ہے۔لیکن مسلمانوں نے باوجود اپنے زوال کے اردو زبان و ادب کو خوب چمکایا۔ڈاکٹر تاثیر،محمد دین تاثیر یکم جون ۱۹۰۱ء کو امرتسر کے ایک قصبہ اجنالہ میں پیدا ہوئے۔ابھی تین سال کے ہی تھے کہ انہیں امرتسر اپنی خالہ کے گھر آنا پڑا۔انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور، مسلمانان لاہور کی قدیم ترین، تعلیمی و سماجی تنظیم ہے جو ۱۸۶۹ء میں قائم ہوئی تھی۔علامہ اقبال اس کے رکن دوامی اور صدر بھی رہے۔تاثیر اس کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے۔علامہ اقبال سے تاثیر کا تعلق بچپن ہی سے تھا۔علامہ اقبال کو جب بھی اپنے کلام میں انگریزی ترجمے کی ضرورت ہوتی، وہ تاثیر کو ترجمہ کرنے کو کہتے۔علامہ کو اپنے کلام پر تاثیر کی تنقید کا بھی انتظار رہتا تھا۔علامہ ہندوستان سے باہر جاتے یا تاثیر، دونوں میں خط و کتابت رہتی تھی۔تاثیر کے احباب کے نام خطوط میں اکثر ایسے حوالے ملتے ہیں۔لیکن تاثیر کے نام علامہ کا صرف ایک خط دستیاب ہے، جو بھوپال سے ۲۲ جولائی ۱۹۳۵ء کو لکھا گیا تھا اور انوار اقبال میں شامل ہے۔میاں شاہ دین ہمایوں باغبان پورہ لاہور کے مشہور میاں خاندان کے چشم و چراغ تھے۔۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے۔طبیعت شروع سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔انگلستان جانے سے قبل قدیم رنگ میں عشقیہ غزلیں کہتے تھے۔جسٹس شاہ دین ہمایوں سے علامہ اقبال کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔میاں صاحب ۱۸۹۰ء میں ولایت سے بیرسٹر بن کر آئے تو ایک طرف اُن کا علی گڑھ تحریک سے خاص تعلق پیدا ہوا، دوسری طرف وہ لاہور کے قابل نوجوانوں کے دائرے کے مرکز بن چکے تھے۔اس دائرے میں اقبال

بھی شامل تھے۔ چنانچہ اپنی پہلی نظم ''چمن کی سیر'' میں جو اکتوبر ۱۹۰۱ء کے مخزن میں شائع ہوئی۔ اقبال نے بھی اپنے بعض اشعار میں ہمایوں کا ذکر نہایت محبت سے کیا ہے۔ ۲ جولائی 1918ء کو ہمایوں نے لاہور میں انتقال کیا اور اپنے آبائی قبرستان واقع باغبان پورہ میں دفن ہوئے۔ اس سانحہ ارتحال پر اقبال نے اپنے جذبات غم کا اظہار اس نظم میں کیا ہے جو ''بانگ درا'' میں ''ہمایوں'' کے نام سے موجود ہے۔ مولوی محبوب عالم سیالکوٹ سے تعلیم کے سلسلے میں لاہور آنے کے بعد اقبال کو جن احباب کی اولین صحبت میسر آئی، ان میں مولوی محبوب عالم مدیر ''پیسہ اخبار'' لاہور بھی تھے۔ اقبال کے مضامین، ان کی نظمیں، غزلیں، ان کی ذہنی وفکری صلاحیتیں اور دیگر سرگرمیاں جس اخبار کے ذریعے سب سے پہلے عوام کے سامنے آئیں وہ ''پیسہ اخبار'' ہی تھا۔ مولوی صاحب کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا اور آپ لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں دفن کیے گئے۔ آپ کے جنازے میں سر میاں محمد شفیع، سر فضل حسین اور علامہ اقبال بھی شریک تھے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں اقبال کے نہایت ہی گہرے، بے تکلف، عزیز اور مخلص دوستوں میں نواب سر ذوالفقار علی خاں کا درجہ بہت ممتاز تھا۔ اقبال کے تعلقات ان سے حقیقی بھائیوں جیسے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ تھے۔ اپنے قلم کے ذریعے اقبال کو شاعر اور مفکر کی حیثیت سے سب سے پہلے جس نے انگریزی خوانوں کے سامنے پیش کیا اور ان کے ذہنی اور دماغی جوہر دنیا جہاں میں آشکار کیے، وہ نواب صاحب ہی تھے۔ ان کی کتاب A voice from the east (مشرق سے ایک آواز) اقبالیات میں کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اب تک جتنی بھی کتابیں اقبال کے فکر وفن پر لکھی گئی ہیں، ان میں کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ علامہ اقبال جب بھی

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوتے تو نواب سر ذوالفقار علی خاں کی موٹر میں ہی ان کے ہمراہ ان کو دیکھا جاتا تھا۔منشی محمد دین فوق مدیر ''اخبار کشمیری'' لاہور،اقبال کے دوستوں اور ہم عصروں میں درجہ اختصاص رکھتے تھے۔اقبال کی طرح ان کا خمیر بھی محبت کے ضامن سے اٹھایا گیا تھا۔اقبال اور فوق دونوں کی دوستی لاہور میں پروان چڑھی اور دونوں اسی خاک میں آسودہ خواب ہیں۔فوق صاحب نے بے شمار کتابیں تصنیف کیں جنہیں اقبال نے ہمیشہ پسند کیا اور کئی کتابوں پر تقریظ لکھی۔۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کی وفات کے روز فوق سخت بیمار تھے۔۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کو فوق صاحب خود بھی اپنے حبیب سے جا ملے۔چودھری محمد حسین ۲۸ مارچ ۱۸۹۴ء کو بروز بدھ موضع پہاڑنگ اونچہ تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک جاٹ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدا ہی سے عربی،فارسی،اردو اور اسلامیات کی جانب ان کی توجہ زیادہ تھی۔علامہ کے کہنے پر چودھری صاحب نے شاعری ترک کر دی اور نثر کی طرف توجہ کر کے چند نہایت سلجھے ہوئے متوازن تنقیدی مضامین لکھے۔حضرت علامہ چودھری صاحب کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے؟ اس کا اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے۔آپ ہی کے مخلصانہ مشورے سے علامہ نے اپنا کلام مجموعوں کی صورت میں شائع کروانا شروع کیا۔چودھری صاحب روزانہ بلاناغہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔۱۶ جولائی ۱۹۵۰ء کو چار بجے شام آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔عبدالمجید سالک،مدیر روزنامہ ''انقلاب'' لاہور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔علم و ادب،شعر و سخن،سیاسیات اور صحافت کے میدانوں میں ان کے نام کے جھنڈے گڑے ہیں۔وہ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۳ء کو بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں پیدا ہوئے

اور ۲۷ دسمبر ۱۹۵۹ء کو لاہور کی خاک میں سما گئے۔ انہوں نے بیسیوں کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات ''سرگزشت سالک'' میں نہایت تفصیل سے اپنے حالات بیان کیے۔ اس میں علامہ اقبال سے ملنے اور ان کی صحبتوں میں شریک ہونے کے واقعات بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ماہر اقبالیات اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بانی ڈائریکٹر۔ اقبالیات کے موضوع پر آپ کی کئی کتب اور مضامین ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ کی اقبالیات میں معروف کتب میں فکر اقبال، تلخیص خطبات اقبال، مقالات حکیم جلد دوم: اقبالیات، اقبال اور ملا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے مرشد اقبال مولانا جلال الدین رومی پر بھی کتب تحریر کیں۔ آپ کا انتقال ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو ہوا۔

لاہور میں علامہ اقبال کے آخری ایام! علالت و وفات:

اگر ہم علامہ اقبال کے شب و روز کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ وہ بظاہر تندرست اور توانا نظر آتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی نہ کسی اعتبار سے وہ اکثر جسمانی تکلیف کا شکار بھی رہے ۱۹۲۲ء میں جب آپ نے نظم خضر راہ پڑھی۔ اُن دنوں آپ نقرس کے مرض میں مبتلا تھے نظم بیٹھ کر پڑھی۔ ۱۹۳۲ء ہی میں جب آپ نے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی تو آپ کی ناک پر پھوڑا نمودار ہوا جس سے علامہ اقبال خاصے خوف زدہ ہو گئے مگر اللہ کے فضل سے صحت یاب ہو گئے اسی دوران اخبارات میں خبر شائع کہ علامہ کا گلا بیٹھ گیا ہے وہ بات چیت نہیں کر سکتے۔ اس زمانے میں آپ حکیم عبدالوہاب نابینا دہلوی کے زیر علاج تھے جس سے آپ کو افاقہ ہوا۔ لاہور میں ڈاکٹر عبدالمجید ملک اور حکیم محمد حسین قرشی آپ کے خصوصی معالج تھے۔ میاں محمد

شفیع، راجا محمد حسن اختر اور دوسرے رفقاء علامہ اقبال کے تیماردار اور نگران تھے۔ ایک دفعہ علامہ اقبال علاج معالجہ کے لیے بھوپال بھی تشریف لے گئے۔ جہاں سید راس مسعود نے درخواست کر کے آپ کو بلوایا تھا اس سفر میں علامہ اقبال کا قدیمی خدمت گار بخش بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ دوسرے ڈاکٹر جو آپ کی صحت کی نگرانی کیا کرتے تھے ان میں ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر جمعیت سنگھ، ڈاکٹر محمد یوسف اور ڈاکٹر الٰہی بخش قابل ذکر ہیں۔ دوستوں میں میاں محمد شفیع، راجا حسن اختر، اور سید نذیر نیازی آپ کی تیمارداری اور دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

اگرچہ علامہ اقبال کی علالت کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے جاری تھا جب ۱۹۳۸ء کا آغاز ہوا تو علامہ اقبال کی علالت نے یک بیک پلٹا کھایا۔ ۲۵ فروری کو دمہ کا دورہ ہوا ایلو پیتھک علاج شروع ہوا۔ انگریزی دواؤں سے علامہ اقبال کو نفرت تھی۔ ۳ مارچ ۱۹۳۸ء کی شب علامہ پر ضعف قلب سے غشی طاری ہوئی اور اسی حالت میں پلنگ پر سے گر گئے حکیم محمد قرشی انتہائی عقیدت مند دوست کی حیثیت سے حضرت علامہ اقبال کے علاج میں مصروف ہو گئے خوش گوار دوائیں پلاتے اور خوش گوار باتیں کرتے۔ درد پشت اور درد مثانہ کے عوارض شروع ہو گئے ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے دیکھا تو مایوسی ظاہر کی علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے حرف تسلی کہنے کی کوشش کی تو علامہ اقبال نے فرمایا ''میں مسلمان ہوں اور مسلمان موت سے نہیں ڈرتا''۔

۲۰ اپریل کو سہ پہر کے وقت علامہ درد پشت کی وجہ سے بے چین تھے ۱۹ اپریل کی شام سے علامہ اقبال کو بلغم میں خون آ رہا تھا پچھلے پہر بے چینی شروع ہوئی۔ پھر اپنی رباعی پڑھی جو کہ گذشتہ دسمبر میں کہی تھی اور ۱۹۳۸ کے آخر میں ارمغان حجاز میں شائع ہوئی۔

سرود رفتہ آید کہ نہ آید
نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد این روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کر نہ آید

ٹھیک سوا پانچ بجے صبح کے قریب درد کی حالت میں حضرت حکیم الامت نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے پیدا کرنے والے کے حضور سرخرو ہو گئے۔ حرم پاک کی زیارت دل ہی میں رہی اور اس صدی کا سب سے بڑا عاشق رسول اپنے خالق حقیقی کے حضور چلا گیا۔

آپ کے انتقال کی خبر چند لمحوں میں شہر کے اندر پھیل گئی تمام سرکاری دفاتر، سکول و کالج بند کر دیئے گئے۔ شہر کے ہر گوشے میں عقیدت مند جاوید منزل پہنچنا شروع ہو گئے۔ حضرت علامہ اقبال کے مدفن کی جگہ بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے بائیں جانب خالی احاطہ میں قرار پائی۔

جاوید منزل سے آپ کا جنازہ ریلوے اسٹیشن اور بند روڈ سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج پہنچا۔ جنازے کے ساتھ پچاس، ساٹھ ہزار ہندو مسلمان شامل تھے۔ آٹھ بجے شب نماز جنازہ ادا کی گئی اور پونے دس بجے یہ عزیز و محبوب جسم سپرد خاک کر دیا گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ ء نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

علامہ اقبال کے انتقال پر لاہور اور ہندوستان کے تمام شہروں میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے اور اخبارات و رسائل نے خاص نمبر شائع کیے۔

تصانیف اقبال لاہور میں

علامہ اقبال نہ صرف ایک عظیم شاعر اور بلند پایہ مفکر تھے بلکہ ایک عظیم مصنف بھی تھے۔اس لیے کہ انہوں نے اُردو شعرا کی عام روش کے برعکس نثر میں بھی کئی مستقل اور بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ مقالات ومکتوبات، تقاریر وخطبات اور شذرات و ملفوظات ان کے علاوہ ہیں۔

علم الاقتصاد نثر میں علامہ اقبال کی یہ پہلی تصنیف ہے۔۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور ایم اے کر کے جب علامہ اقبال نے اورینٹل کالج اور بعدازاں گورنمنٹ کالج سکالرشپ اختیار کی تو انہوں نے معاشیات کے موضوع پر کتاب لکھی۔علم الا قتصاد کا دیباچہ کئی وجوہ سے اہم ہے۔علامہ نے اس میں پہلے معاشیات کی تعریف کی ہے پھر اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ کتاب انگریزی کتاب کا ترجمہ یا چربہ نہیں بلکہ یہ کتاب بہت سی مستند کتابوں کا نچوڑ ہے۔ بانگ درا علامہ اقبال کا پہلا اُردو مجموعہ بانگ درا پہلی بار ستمبر ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ بانگ درا سے پہلے اسرار خودی، رموز بےخودی اور پیام مشرق کی اشاعت ہوئی۔ بانگ درا کے پہلے حصہ میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں اور غزلیں ہیں دوسرا حصہ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔اور تیسرے حصے میں ۱۹۰۸ کے بعد کا کلام شامل ہے۔ بانگ درا کا آغاز علامہ کی مشہور مسدس نما نظم ''ہمالہ'' سے ہوتا ہے۔بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ بال جبریل میں اول غزلیات ہیں پھر رباعیات وقطعات اور آخر میں مختلف عنوانات کے ماتحت نظمیں درج کی گئی ہیں۔ بال جبریل عرصہ دراز کے بعد لوگوں کے ہاتھ میں آئی تو علم ہوا کہ علامہ نے اردو شعر گوئی سے اجتناب نہیں کیا۔ضرب کلیم یہ

کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب کے سیاسی، مذہبی، ملی، معاشرتی مسائل اور پیچیدہ مباحث پر جس خوش اسلوبی کے ساتھ علامہ اقبال نے فتوے لگائے ہیں وہ انداز بیاں انہیں کے لیے مخصوص ہے۔ضرب کلیم اپنے عہد کے خلاف اعلان جنگ ہے۔تاریخ ہند علامہ اقبال کی درسی کتابوں کے سلسلہ کی ایک کتاب ہے جسے انہوں نے لالہ رام پرشاد پروفیسر تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور کے اشتراک سے مرتب کیا۔یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں پہلی بار منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور نے شائع کی۔ اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔فلسفہ خودی پر فارسی میں علامہ اقبال کی یہ پہلی تصنیف ہے اس کا کچھ حصہ علامہ نے ۱۹۱۴ء میں لاہور کے ایک جلسہ میں سنایا تھا۔دیباچہ علامہ اقبال نے خود لکھا۔اسرار خودی ہیئت اور مضمون کے لحاظ سے ایک طویل نظم ہے۔بنیادی طور پر یہی تصنیف علامہ کے فکر و فن کا رُخ متعین کرتی ہے اور اسی کی بدولت وہ ایک چونکا دینے والے شاعر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آتے ہیں۔رموز بے خودی دراصل اسرار خودی کا دوسرا حصہ ہے۔۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔اسرار خودی میں ان اصولوں اور ضابطوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو انفرادی خودی کی نشو و نما اور تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔اور جن کے اپنانے سے فرد کی زندگی ارتقائی منزلوں سے گزر کر نیابت الٰہی کے منصب تک جا پہنچتی ہے۔رموز بے خودی میں خودی فرد سے آگے بڑھ کر پوری ملت یا قوم کی خودی کی تربیت و ارتقاء و استحکام کی راہیں دکھاتی ہیں۔فرد اور ملت کے باہمی رشتوں کی اہمیت اور ان کی استواری کے راہنما اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔پیام مشرق یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔اس فارسی تصنیف کا دیباچہ علامہ اقبال نے خود لکھا۔اور اُسے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں شاہِ

افغانستان کے حضور پیش کیا۔ کتاب کی ترتیب یوں ہے کہ اوّل لالہ طور کے نام سے رباعیات اور قطعات ہیں پھر افکار کے عنوان سے مختلف نظمیں ہیں اس کے بعد مئے باقی کے تحت غزلیات درج ہیں پھر نقش رنگ کے ذیل میں بعض نظمیں ہیں۔ مسائل مغرب پر تبصرہ ہے۔ آخر میں خُردہ کی سرخی کے ماتحت مشرق اشعار و قطعات ہیں۔ جاوید نامہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ ناقدین کا اتفاق ہے کہ یہ اقبال کے شاعرانہ کمال کی معراج اور تصورفن کا شاہکار ہے۔ اس سے پہلے علامہ نے جو لکھا تھا وہ فکروفن قدر اوّل کی چیز تھی لیکن جاوید نامے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا گیا ایسے بلند مقام سے کہا گیا جہاں الہام اور شعر عرفاں اور ادبیات عالیہ کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ پوری کتاب شاعرانہ پرواز اور ادبی فنکارانہ لطافتوں سے مالا مال ہے۔ اس کتاب کی جدت یہ ہے کہ شاعر نے پیر رومی کے ذریعے سیر افلاک کی ہے مختلف سیاروں میں ارواح اور ملائک سے ملاقات کی ہے اُن سے حقائق و عہد حاضر کے اہم مسائل پر سوالات و جوابات ہوئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے کا عنوان ''خطاب بہ جاوید'' جس میں علامہ نے اپنے بیٹے جاوید اقبال کو مخاطب بنا کر نژادنو سے ہم کلام ہوئے ہیں اور اسی رعایت سے نام ''جاوید نامہ'' ہے۔ زبور عجمیہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی اس مجموعہ میں اوّل زبور عجم ہے جس کے دو حصے ہیں جو مختلف غزلیات وقطعات پر مشتمل ہے اس کے بعد دو مثنویاں ہیں اس کے بھی دو حصے ہیں۔ اس کے بارے میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں زبور عجم کے چار حصے ہیں پہلے حصہ میں انسان کا راز و نیاز خدا کے ساتھ دوسرے حصے میں آدم کے خیالات۔ تیسرے حصے میں مثنوی گلشن (محمود شبستری) کے سوالوں کے جواب ہیں اس کا نام میں نے

گلشن راز جدید تجویز کیا ہے۔مثنوی کا مضمون یہ ہے کہ غلامی کا اثر فنون لطیفہ یعنی موسیقی وغیرہ پر کیا ہوتا ہے؟ کل مجموعے کا نام زبور عجم ہے۔اس کتاب کی غزلوں کے ذریعے بیداری، ذوق عمل، محبت اور زندگی پیدا کرنے کا درس دیا ہے۔ارمغان حجاز علامہ اقبال کے آخری برسوں کا اُردو اور فارسی کلام ہے۔اقبال نے اسے مرتب کردیا تھا لیکن اشاعت کی نوبت وفات کے چھ ماہ بعد ۱۹۳۸ء میں عمل میں آئی۔دوتہائی سے زائد حصہ فارسی قطعات اور بقیہ اُردو نظموں پر مشتمل ہے۔کتاب کے دو حصے ہیں۔اوّل حصہ میں فارسی کلام اور حصہ دوم میں اردو کلام ہے۔حصہ اوّل میں کئی ابواب ہیں۔ا۔حضور حق،۲۔حضور رسالت،۳۔حضور ملت،۴۔حضور عالم انسانی،۵۔یارانِ طریق۔حضور ملت اور حضور عالم کے ذیل میں تعلیمات کے لحاظ سے متعدد نظمیں ہیں۔یہ سب فارسی رباعیات وقطعات پر مشتمل ہیں۔تحقیقی مقالہ ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقاء برصغیر پاک وہند کے عظیم مفکر علامہ اقبال کا پی ایچ ڈی میں فلسفہ کے موضوع کا مقالہ تھا جو انہوں نے جامعہ میونخ میں ۱۹۰۸ء میں جمع کروایا اور اسی سال شائع ہوا۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یہ کتاب علامہ کے خطبات پر مبنی ہے اور اصلاً انگریزی میں ہے اور ۱۹۳۰ء میں ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' پر چھ خطبات کے نام سے چھپی۔۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ پریس لندن سے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ The Reconstruction of Religious thought in Islam کے نام سے شائع کی۔۱۹۵۸ء میں بزم اقبال لاہور سے اس کتاب کا اردو ترجمہ تشکیل جدید الٰہیات کے نام سے منظر عام پر آیا۔ترجمہ سید نذیر نیازی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔جیسا انہوں نے خود بیان کیا ہے یہ ترجمہ انہوں نے

علامہ اقبال کی زندگی میں ہر طرح سے مکمل کر لیا تھا لیکن بعض وجوہ سے چھپ نہ سکا۔

علامہ اقبال کی شاعری کا اجمالی جائزہ:

علامہ اقبال نے جس دور میں جنم لیا وہ ایک عالمگیر سیاسی وعمرانی انقلابات کا دور تھا انیسویں صدی عیسوی ختم ہو رہی تھی لیکن اس کے اثرات ابھی باقی تھے۔اور عالم انسانی پر جنگ کے مہیب بادل منڈلا رہے تھے پہلی جنگ عظیم کے آتشیں لاوے نے پھٹ کر دنیا کو ہلا کر رکھ دیا کہ عرصہ روزگار پر ایک دوسری عالمگیر جنگ کے سیاہ بادل منڈلانے لگے تھے اور یہ تمام واقعات علامہ اقبال کی زندگی میں ہو گزرے۔ان واقعات کے بڑے بڑے ہیرو مغرب کے قومی ہیکل دیو استبداد تھے جو جمہوری لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔اور گزشتہ اڑھائی صدی کے عرصہ میں اہل مشرق کا جینا مشکل بنائے ہوئے تھے۔

یہ دور اہل مشرق کے زوال کا دور تھا۔مشرق میدان عمل سے پسپا ہونے لگےاور مغرب شاہ راہ ترقی پر گامزن۔نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی تک مشرق میدان حرب و ضرب میں مغرب سے پوری طرح شکست کھا بیٹھااور اس تصادم کا رخ میدان جنگ اندرون خانہ یعنی تہذیب و معاشرت کی طرف ہوگیا۔انیسویں صدی کے مصلحین جہاں تک برصغیر پاک و ہند کا تعلق ہے انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد مغرب کی علمی ترقی اور تہذیبی روشنی سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ بلاتردد جدید مغربی علوم کی تحصیل کے لیے آمادہ ہوگئے اور اس طرز تعلیم کو جسے لارڈ میکالے نے قوم کے افراد کو اپنے انداز فکر پر لانے کے لیے وضع کیا تھا فوری اغراض و مقاصد کی خاطر دل و جان سے قبول کر لیااور تعلیم سے گزر کر تہذیب و معاشرت کے میدان میں بھی مغربی طرز زندگی

پر فریفتہ ہونے لگے۔اور ایک نئی نسل پلنے لگی جو رنگ و نسل کے اعتبار سے دیسی تھی لیکن ذھناً مغرب کا چرچا۔۱۸۵۷ء مسلمانوں کا رہا سہا اقتدار بھی جاتا رہا اب سوال یہ تھا کہ ماضی میں جو کچھ ہوا تو ہوا۔اب ہندوستان کا مستقبل کیا ہے؟ ہمیشہ کی غلامی اور محکومی یا پھر سے آزادی۔ یہ علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت تھی۔ان کا اخلاقی اور انسانی ضمیر جس نے اہل وطن کو جن کا سیاسی شعور مردہ ہو چکا تھا اور ملی روح خوابیدہ۔آپ نے انہیں بروقت متنبہ کیا کہ ماضی سے درس عبرت لیں۔حالات کو دیکھیں۔زمانہ بدل چکا ہے۔کیوں نہ اپنے ضمیر اور باطن کو جھنجوڑیں۔علامہ اقبال کی نگاہیں تاریخ پر تھیں۔سیاسی و اجتماعی حقائق کے ساتھ ساتھ اس تبدیل شدہ صورت حال پر جو سرکار برطانیہ کی بدولت پیدا ہوئی۔ہندوستان کی زمام اقتدار اب اُس کے ہاتھ میں تھی۔ایک ہی آئین ایک ہی حکومت اور ایک ہی عمل داری تھی۔جس کے ماتحت سب زندگی گزار رہے تھے۔اور اس کی اصلاح کا کوئی امکان نہ تھا۔وہ صدمہ جو ۱۸۵۷ء میں اہل وطن کو پہنچا۔حالات کا تقاضا تھا کہ ان کے اذہان و قلوب میں ایک بنیادی تبدیلی ہو۔علامہ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے قوم کو اتحاد اور تعاون کا درس دیا۔وہ دیکھ رہے تھے کہ جنگ آزادی سے پہلے ملک کی فضا تعصب اور تنگ نظری کے باعث زہر آلود ہو رہی ہے۔انہوں نے سیاست کا رشتہ اخلاق اور روحانیت سے جوڑا۔نوع انسانی کی محبت اور عالمگیر اخوت کے ان ہمہ گیر روابط اور قدروں کی ترجمانی کی جو معاشرے کا تارو پود ہیں۔اور جن کی بدولت تہذیب و تمدن قائم ہے۔

علامہ اقبال سے پہلے کی شاعرانہ فضا:

غزل نے ذہن انسانی کے جملہ افکار اور جسم و روح کے سارے تقاضوں اور

امنگوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کا ثبوت دیا ہے۔ باصلاحیت اور غزل کے مزاج شناس شعراء نے حسن و عشق، فلسفہ و حکمت، تصوف و اخلاقیات، سیاحت و مذہب، وطنیت اور قومیت اور آزادی غرض ہر قسم کے موضوعات و میلانات کو غزل میں جگہ دی ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے ربع اول سے جیسے ہی اس تہذیبی زندگی میں مغرب و مشرق کی آویزش قدیم و جدید کے تصادم اور سیاسی و سماجی ہلچل کے آثار رونما ہوئے احساس کے تازہ دریچے کھلنے لگے اس تغیر کا واضح ثبوت غالب کی غزل گوئی ہے۔ جس نے اُردو غزل کو آرائش جسم اور کاکل کی تنگ وادی سے نکالکر اندیشہ ہائے دور دراز کی کشادہ منزلوں تک پہنچایا۔ مغرب و مشرق یا قدیم و جدید کے ٹکراؤ نے جب ایک واضح صورت اختیار کر لی اور مغرب کی تہذیبی قدروں نے یلغار کر کے مشرقی تمدن کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تو اس تصادم سے زندگی کے نئے شرارے پھوٹے۔ شکستہ دلوں میں اپنے تحفظ و تشخص کا ایک نیا احساس ابھرا۔ ہمہ وقت جذبوں سے کھیلنے کے بجائے عقل سے کام لینے کی اہمیت محسوس کی گئی اور ملک و ملت کی تعمیر و اصلاح کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ اسمعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی ان ہی کے اثرات کے تحت جنم لینے والی شاعری کے نمائندے ہیں۔ آزاد اور حالی کی لائی ہوئی تبدیلیوں کا اثر عام آدمی پر دیر میں ہوا۔ روایتی غزل ہی چلتی رہی اور امیر مینائی اور داغ دہلوی کے رنگ سخن کو قبول عام حاصل رہا۔ مولا الطاف حسین حالی جن کی راہ سخن اور طرز فکر سے داغ بہت مختلف تھے۔ وہ بھی داغ کے انداز غزل سرائی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ تھا وہ تہذیبی ماحول اور شاعرانہ فضا جس میں اقبال نے آنکھ کھولی، ان کے ذوق و شوق کی تربیت ہوئی اور ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔

علامہ اقبال کی شاعری کا جائزہ:

علامہ اقبال ابتداء میں داغ وامیر کی طرف لپکے اور غزل گوئی میں ان کی پیروی کو مستحسن خیال کیا تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ان کے گردو پیش اور اُن کے آغاز شباب کی امنگوں کا تقاضا یہی تھا کہ وہ عشق سخن کی ابتداء غزل سے کرتے اور اُسی رنگ کو اپناتے جس پر چھوٹے بڑے سبھی جان چھڑک رہے تھے۔چنانچہ علامہ اقبال نے بھی یہی کیا یعنی غزل گوئی سے شاعری کا آغاز کیا لیکن بحیثیت مجموعی ان پر زیادہ گہرا اثر داغ کا رہا۔چنانچہ آپ نے ان کی شاگردی قبول کی۔اس رنگ میں خیال افروزی،فکر انگیزی کے بجائے زیادہ توجہ ہلکے پھلکے عشقیہ جذبات کی نمائش معاملات، محبت میں عاشق ومعشوق کی نوک جھوک اور زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ اور چٹخارے کو دی جاتی تھی۔علامہ اقبال کی ابتدائی غزلیں اسی رنگ میں ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری کے ادوار!(پہلا دور سیالکوٹ تا لاہور):

علامہ اقبال کی شاعری کے پانچ ادوار قرار پاتے ہیں۔پہلا دور ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۰۰ء پر ختم ہوتا ہے اور سیالکوٹ کی زندگی اور قیام لاہور ۱۸۹۵ء کے ابتدائی تین چار برسوں تک محدود ہے۔اس دور میں علامہ اقبال نے زیادہ تر ہلکی پھلکی غزلیں کہی ہیں اس سلسلے میں انہوں نے ارشد گورگانی سے اور بعد ازاں داغ دہلوی سے با قاعدہ سخن کیا ہے۔۱۹۰۰ء سے پہلے ہی لاہور میں شعر وشاعری کی محفلوں کی رونق بہت کچھ اُن کے دم قدم سے قائم تھی اور غزل کی بجائے نظم پر توجہ مرتکز ہوئی۔علامہ اقبال کی شاعری کی پہلی منزل سیالکوٹ سے لے کر یورپ جانے سے پہلے تک کی

لاہور کی زندگی پر محیط ہے۔علامہ اقبال کے ابتدائی سترہ، اٹھارہ سال سیالکوٹ میں گزرے جہاں مولانا میر حسن کی تعلیم و تربیت نے شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا کردی۔اور آپ نے اسکول کے زمانہ طالب علمی ہی میں شعر کہنے شروع کردیئے۔حتیٰ کہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے اُن کی غزلیں اخبار ورسائل میں چھپنے لگیں تھیں۔ یہ اس کے بعد علامہ اقبال کی شاعری کا چرچا ہوگیا تھا اور انہیں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں نظم پڑھنے کی دعوت دی گئی اور یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک یورپ جانے سے قبل تک قائم رہا۔

لاہور میں علامہ اقبال کی شاعری کے دوسرے دور کا جائزہ (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء)

اس دور کی غزلوں میں اگرچہ داغ ہی کا اثر نظر آتا ہے۔لیکن اس دور میں ان کی نظمیں داغ سے الگ ہوکر حالی کے زیر اثر آنے لگی ہیں۔اس دور کی غزلوں کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت مناظر فطرت کی عکاسی اور جذبہ حب الوطنی سے سرشاری ہے۔اس دور کی نظموں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اُن کی تہہ میں علامہ کے فلسفہ خودی کے بعض اجزاء کلبلاتے نظر آتے ہیں۔خودی کے اجزاء میں انسان کی فضیلت، اس کی مخفی روحانی قوت، عقل و عشق معرکہ خیر و شر اور حیات جاودانی کی آرزومندی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اس دور کی نظمیں بزم قدرت، مکڑا مکھی، عقل و دل، پرندہ اور جگنو اور کنار راوی وغیرہ۔مناظر فطرت کی مصوری کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد وطنیت اور اصلاح کا جوش وجذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

لاہور میں علامہ اقبال کی شاعری کے تیسرے دور کا جائزہ:

اس دوران میں آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے اور شعر و شاعری ترک کرنے کا سوچا۔ یہ دور بعض وجوہ سے علامہ اقبال کے لیے بڑی الجھنوں کا دور تھا اور یہ الجھنیں فلسفہ خودی کی تخلیق یعنی ۱۵۔۱۹۱۷ تک شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔ اگر شیخ عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ آڑے نہ آجاتے تو علامہ اقبال شعر گوئی سے ہاتھ اٹھا لیتے۔ لیکن اُن کے تصور فکر و فن میں جیسی تبدیلاں اس دور میں ہوئیں کسی اور دور میں نہیں ہوئیں۔ اب آپ محض شاعر نہ رہے بلکہ مخصوص فلسفہ حیات کے داعی بن گئے۔

لاہور میں علامہ اقبال کی شاعری کے چوتھے دور کا جائزہ! (۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۴ء)

معنوی حیثیت سے علامہ اقبال کی شاعری کا یہ اہم ترین دور ہے۔ انگلستان سے لاہور پہنچے تو بہت دنوں تک یورپ کی محفلوں خصوصاً عطیہ کے ساتھ مجلس آرائیوں کا اثر ذہن پر چھایا رہا۔ لندن کے مقابلے میں لاہور کی زندگی بے کیف، پہلی شادی کم عمری میں، تعلقات کشیدہ دوسری شادی کے بارے میں فکر مند تھے۔ یورپ کی صحبتیں بھلائے نہ بھولتی تھیں۔

انگلستان اور جرمنی میں سہ سالہ قیام کے دوران علامہ اقبال نے وقتاً فوقتاً چند متفرق موضوعات پر نظمیں بھی کہیں جو بانگ درا کے حصہ دوم میں شامل ہیں ان میں حسن و عشق، انسان اور کائنات کے مسائل پر مفکرانہ نظر ملتی ہے۔ قیام نگلستان کے دوران جس بات نے انہیں سچ مچ کا مسلمان بنادیا وہ اسلام کی حقیقی روح اور اُس کا اجتماعی نصب العین تھا جو یورپ کی نسلی و ملکی قومیت اور مادیت والحاد کے ہلاکت خیز ماحول میں رہتے ہوئے ان پر منکشف ہوا۔ اپنے مقالے ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' کی تیاری کے دوران فارسی کی شعری و فکری روایت کے گہرے مطالعے کا

موقع ملا اور جہاں وہ فارسی کے دلا ویز اسلوب سے متاثر ہوئے۔وہاں اس کے اندر پوشیدہ بعض افکار سے بھی متاثر ہوئے علاوہ ازیں مغرب کے مادی فلسفوں اور علم الحیات کے نئے زوایوں نے نیا لحاد کی جن راہوں کو کشادہ کیا اور کلیسائی نظام سیاست کے زوال اور سیکولزم کے فروغ اور اس کے نتیجے میں وطنی قومیت کا جو سیاسی تصور ابھرا۔وہ نوع انسانی کی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ تھا۔یورپ کی استعماری طاقتوں نے مشرقی ایشیاء وافریقہ کی پس ماندہ اقوام کو غلام بنالیا اور اُن کے معدنی وسائل پر قبضہ جمانا شروع کیا۔مزید یہ کہ علامہ اقبال سفر یورپ سے پہلے مغرب کے وطنی قومیت کے تصور سے متاثر تھے مگر واقعات کی رفتار نے حقیقت سے پردہ اٹھایا اور علامہ اقبال وطنی قومیت کے سیاسی مضمرات سے پورے طور پر آگاہ ہوگئے اور وطنی قومیت کے خول سے نکل کر وسیع تر انسانی اتحاد کے لیے مسلم قومیت کے نظریہ کو ابھارا۔علامہ اقبال کے فکروفن کے تین بنیادی مجموعے اسرار خودی، رموز بیخودی، اور پیام مشرق یکے بعد دیگرے فارسی زبان میں منظر عام پر آئے۔پیام مشرق کے ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں اُردو کا پہلا مجموعہ بانگ درا شائع ہوا۔

لاہور میں علامہ اقبال کی شاعری کے پانچویں دور کا اجمالی جائزہ

۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۸ء:

۱۹۲۳،۲۴ء یعنی پیام مشرق اور بانگ درا کی اشاعتوں کے بعد علامہ اقبال کی شاعری کا پانچواں باب شروع ہوتا ہے۔اور یہ دور وفات تک قائم رہتا ہے۔اس دور میں زبور عجم ۱۹۲۷ء جاوید نامہ ۱۹۳۲ء مسافر ۱۹۳۴ء پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق ۱۹۳۶ء ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء بال جبریل ۱۹۳۵ء جیسی بلند پایہ کتابیں شائع

ہوئیں۔اس آخری دور کی شاعری میں بلحاظ مواد و ہیئت اور زبان و بیان کوئی ایسی تبدیلی نظر نہیں آتی جس کے سبب اسے چوتھے دور کی شاعری میں الگ کیا جا سکے۔ یہ حیثیت مجموعی اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ اس چوتھے دور کی شاعری میں خصوصاً طلوع اسلام اور خضر راہ جیسی طویل نظموں میں جس قسم کا جوش وخروش موجیں مار رہا ہے وہ آخری دور کی نظموں میں بہت کم نظر آتا ہے۔غالباً وجہ یہ تھی کہ اس دور میں شاعر کے سامنے پہلی جنگ عظیم، جنگ بلقان، جنگ طرابلس، مسجد کانپور اور زوال خلافت عثمانیہ جیسے طاقتور محرکات موجود نہ تھے۔ چنانچہ اس دور میں شاعری کی جو معنوی حیثیت ہے وہ دراصل چوتھے دور کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بے خودی کی والہانہ تفسیر ہے۔الغرض علامہ اقبال کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علامہ اقبال کی پوری شاعری عصر حاضر کے خلاف اعلان جنگ کی مظہر ہے۔ بال جبریل اور ضرب کلیم اسی اعلان جنگ کے متعلق کتابیں ہیں۔ یہ جنگ سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ سامراجیت کے خلاف ہے۔محکومی اور غلامی کے خلا ف ہے بے انصافی، استحصال اور ظلم کے خلاف ہے۔تہذیب کی خرابیوں کے خلاف ہے۔اور اس کا مقصد کیا ہے؟ یہی کہ ایشیاء اور افریقہ کی مظلوم میں جذبہ بیداری اور احساس خودی پیدا ہو اور وہ اس دنیا میں ایک ایسے عادلانہ اور منصفانہ نظام کی داعی ہوں۔جس میں خلق خدا چین سے زندگی بسر کر سکے اور اقبال کے نزدیک یہ چیز صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ اسلام کی حقیقی روح کو پہچانا جائے اپنایا جائے۔اور اسے عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں عمل میں لایا جائے وہ مشرق میں ایک نئی روح کے اور ایک نئی قیادت کے آرزو مند تھے جس میں روح مشرق یعنی قومی خودی پوری توانائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو۔

اقبالیاتی ادارے، مقالات

اقبال اکادمی پاکستان کی مختصر تاریخ

مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ میں علامہ اقبال نے جو کارنامہ سرانجام دیا۔اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب وتمدن کے نقائص سے آگاہ کیا۔انہوں نے ایشیا والوں کو اپنی قدیم تمدنی روایات کو ازسرنو زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی تاکہ وہ مغربی تمدن کے مہلک اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

پاکستان بننے کے بعد حکومت پاکستان نے بجا طور پر محسوس کیا کہ اس ملک کی نظریاتی بنیاد کو مستحکم کرنے کے لیے اقبال کے افکار کی ترویج واشاعت نہایت ضروری ہے تاکہ ملک کے اندر اور باہر لوگوں کو اقبال کے فلسفہ حیات اور ان کے کارناموں سے روشناس کیا جائے اس مقصد کے لیے حکومت پاکستان اقبال اکادمی کا قیام عمل میں لائی۔

اقبال اکادمی پاکستان کا قیام:

اقبال اکادمی پاکستان کا ادارہ نیم سرکاری حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں کراچی میں قائم ہوا۔اس وقت کراچی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔اس لیے اس اکادمی کا دفتر بھی کراچی میں ہی رکھا گیا۔اقبال اکادمی پاکستان کے قیام کی منظوری ایک ایکٹ کی

صورت میں دی گئی۔جس کو اقبال اکادمی ایکٹ ۱۹۵۱ء کا نام دیا گیا۔ جب دارا لحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا تو کراچی میں قائم وفاقی ادارے بھی اسلام آباد منتقل ہو گئے۔لیکن اقبال اکادمی پاکستان اسلام آباد کے بجائے لاہور منتقل کی گئی۔اس کی وجہ لاہور کو اقبال سے نسبت ہے کیونکہ اسی شہر میں اقبال نے تعلیم حاصل کی۔اقبال اکادمی ۱۹۷۵ء میں کراچی سے لاہور منتقل ہوئی اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں اکادمی نے ہنگامی بنیادوں پر کام کر کے اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر ۶۰ سے زائد کتب شائع کیں اس کاوش میں اکادمی کو وزارت ثقافت اور وزارت تعلیم کا تعاون حاصل رہا۔۱۹۷۷ء کا ہنگامہ خیز دور گزرنے کے بعد اکادمی کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں تو وزیر تعلیم جناب ڈاکٹر محمد افضل صاحب نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمد منور جیسے ماہر اقبالیات کو اکادمی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی دعوت دی اور پروفیسر محمد منور کو اکادمی کا ناظم مقرر کیا۔اور اس کے ساتھ ہی ملی وحدت کے جذبے سے سرشار نوجوانوں کی ایک ٹیم منتخب کر کے ناظم اکادمی کے سپرد کی۔اس ٹیم نے اقبال کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اقبال اکادمی پاکستان کے مقاصد:

۱- علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے پیغامات کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانا ہے۔

۲- تحقیقی کام اور منصوبوں کے لیے وظائف دے کر ریسرچ سکالر مقرر کرنا۔

۳- اقبال کی شاعری اور افکار کے مختلف پہلوؤں کو کتابوں، رسالوں اور پمفلٹوں کے ذریعے عام کرنا۔

۴- علامہ اقبال کے متعلق گراں قدر تخلیقی کارناموں پہ اہل قلم اور مصنفین کوانعامات اور عطیات دینا۔

۵- اقبال اکادمی کی جانب سے اقبال پر معیاری کتب کے مصنفین کو معقول معاوضے دینااوران کی کتب کی اشاعت کرنا۔

۶- لیکچروں، مباحثوں، سیمیناروں، نمائشوں دارالمطالعہ اور کانفرنسوں کے ذریعے فکروشعوراقبال کی ترویج کرنا۔

۷- اقبالیات پرکام کرنے والےاوراقبال کے پیغام کی توسیع کرنے والےادیبوں کواعزازی ممبرشپ کامستحق قراردینا۔

۸- ایسےاداروں کے ساتھ تعاون کرنا جوعلامہ اقبال کے کام اور پیغام کوعام کرنے کے لیےقابل قدرخدمات انجام دے رہےہوں۔

اقبال اکادمی پاکستان کے مختلف شعبے:

کام کی سہولت کے لیے اکادمی نے مختلف شعبے قائم کیے ہیں جن میں شعبہ ادبیات، منصوبہ بندی،تصنیف وتخلیق،تدوین،رسائل،حلقہ اقبال،اقبال ایوارڈ، استفسارات،تصانیف وتالیفات،شعبہ تراجم،شعبہ حسابات،شعبہ عکس وآواز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔تمام شعبہ جات ادارے کی ترقی کے لیےعمدہ کوشش کررہے ہیں ان میں سے شعبہ حسابات کا کام اقبال اکادمی پاکستان کی آمدنی واخراجات،عطیات، گرانٹ اورفروحت کتب کا حساب رکھنا اور یہ ریکارڈ تیار کرنا اس شعبے کی ذمہ داری ہے یہی شعبہ اکادمی کا بجٹ تیارکرتا ہےاوراسے منظوری کے لیے پیش کرتا ہے۔

کتب کی اشاعت:

علامہ اقبال کے اپنے مضامین، خطوط، خطبات اور دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ علامہ کے فکروفن پر بھی اقبال اکادمی نے متعدد کتب شائع کی ہیں یہ کتب اُردو انگریزی، عربی، فارسی، بنگالی، سندھی، پشتو اور پنجابی کے علاوہ دیگر کئی زبانوں میں بھی شائع کی گئی ہیں اس کے علاوہ علامہ اقبال کے کلام کے بین الاقوامی زبانوں میں تراجم بھی شائع کیے گئے ہیں اور یوں متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں علامہ اقبال کی کتب شائع ہوئی ہیں۔ کتب اقبالیات میں اولین حیثیت اقبال کی اپنی کتب کو حاصل ہے۔ اقبال کی چار کتب ''علم الا قتصاد''، ''خطبات''، ''کلیات اقبال اردو''، اور ''کلیات اقبال فارسی'' شائع ہو چکی ہیں۔

اقبال کی شخصیت، سیرت اور سوانح پر اب تک جو متعدد کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں سے چند اہم کتب اقبال اکادمی نے شائع کی ہیں۔ ان کتب میں اقبال یورپ میں، اقبال کے آخری دو سال، اقبال کی ابتدائی زندگی، سرگزشت، زندہ رود، iqbal as i knew him شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تحریرات و خطبات اقبال، احوال و آثار اقبال، اقبال کے حضور، ملفوظات اقبال، انوار اقبال، مکاتیب اقبال، مکتوبات اقبال، اقبال کی شاعری، اقبال کا نظام فن، اقبال کی فارسی غزل، نذر اقبال، اقبال از عطیہ بیگم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ اقبال اکادمی پاکستان میں اقبال پر ایک سو انیس کتب اُردو میں لکھی گئیں ان میں سے کچھ ترجمہ شدہ بھی ہیں۔ فارسی میں سولہ، پشتو میں دس، سندھی میں آٹھ، پنجابی میں چار، عربی میں دو اور انگریزی میں چالیس کتب لکھی گئیں ہیں۔

ناظمین:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایک اعلیٰ پائے کے محقق، ماہر اقبالیات، ماہر تعلیم، مفکر اور منتظم تھے آپ ۱۹۵۳ء تک ۱۹۶۵ء اقبال اکادمی کے ناظم رہے۔آپ اکادمی کے اولین ڈائریکٹر تھے۔آپ نے بحیثیت ناظم اکادمی کو مستحکم علمی روایت پر استوار کیا۔بشیر احمد ڈار ۱۹۶۵ء میں آپ اکادمی کے ناظم مقرر ہوئے اور تقریباً پانچ سال تک اس عہدے پر فائز رہے اکادمی کی لائبریری کو خاص وسعت دی اور اس کے علاوہ آپ نے اقبال کے فلسفہ اجتماع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام iqbal philosophy of society تھا ڈار صاحب کی اُردو تصانیف میں سر فہرست ''انوار اقبال'' ہے۔ڈاکٹر محمد عبدالرب ۲۴ فروری ۱۹۷۱ء تا ۵ اپریل ۱۹۷۲ء تک اکادمی سے وابستہ رہے اقبال یا کسی دوسرے موضوع پر ان کی کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا البتہ ''اقبال ریویو' میں ایک آدھ مضمون چھپا ہے۔ڈاکٹر محمد معز الدین ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۲ء تک اکادمی سے وابستہ رہے اس دوران ہنگامی بنیادوں پر کام ہوا اور ایک سال سے کم عرصے میں ساٹھ سے زائد کتب شائع ہوئیں۔ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۸۲ء میں اکادمی کے ناظم مقرر ہوئے ۱۹۸۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے اس دوران آپ نے اکادمی کے منصوبوں پر بڑی تیزی سے کام کیا اور اس کی علمی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔پروفیسر مرزا محمد منور ۱۹۸۵ء میں اکادمی کے ناظم مقرر ہوئے اس وقت اکادمی کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں تھیں۔آپ نے اکادمی کی تنظیم نو کی اور ایک سال سے کم عرصہ میں چھبیس کتابیں منظر عام پر آئیں۔محمد سہیل عمر آپ ۱۹۸۴ء میں اکادمی کے نائب ناظم مقرر ہوئے آپ نے اکادمی کو ایک فعال علمی اور اقبال کے شایان شان ادارہ

بنانے کی کوشش کی۔اکادمی کے لیے کمپیوٹر کا حصول بھی آپ ہی کی کوشش ہے۔اس کے علاوہ پروفیسر شہرت بخاری،ڈاکٹر وحید عشرت،سید عبدالواحد معینی،صوفی غلام مصطفیٰ تبسم،ڈاکٹر محمد باقر اکادمی سے وابستہ رہے اور اکادمی کو فعال اور اہم ادارہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر محمد باقر کے بعد اکادمی کے نائب صدر مقرر ہوئے اقبال کی زندگی شخصیت اور فکر وفن پر ان کی کتب ''مے لالہ فام''،شذرات فکر اقبال،اور زندہ رود قابل ذکر ہیں۔

اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام

محمد اعجاز الحق نے ادارہ اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد ۱۲ جنوری ۲۰۱۸ کو رکھی۔اس ادارے کا افتتاح جناب منیب اقبال پسر زادہ علامہ محمد اقبال نے کیا جو اس ادارے کے سر پرست اعلیٰ بھی ہیں۔ دیگر سر پرستان میں جناب پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران،ڈاکٹر نجیب جمال،ڈاکٹر وحید الزمان طارق،ڈاکٹر وحید الرحمٰن خاں اور ڈاکٹر بصیرہ عنبرین ہیں۔اس ادارے کے جنرل سیکرٹری احسن رامے جب کہ جوائنٹ سیکرٹری ڈاکٹر فرید العطر ہیں۔اس کے بورڈ آف ریسرچرز میں بہت سے قابل اقبال شناس شامل ہیں۔اس ادارے کے قیام کا مقصد علامہ محمد اقبال پر معیاری تحقیق کا فروغ ہے۔اب تک اس ادارے نے بہت سے ریسرچ اسکالرز کو اقبال پر تحقیق میں مدد کی ہے اور ان کو کتب اور دیگر تحقیقی مواد کی مفت فراہمی کی ہے۔اس کے علاوہ اقبال میموریل لیکچرز کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے جس کے تحت ابھی تک دو اقبال میموریل لیکچرز منعقد ہو چکے ہیں۔ پہلے لیکچر میں ڈاکٹر وحید الزماں طارق نے ''اقبال

اور عصر جدید کے تقاضے'' کے تحت لیکچر دیا جب کہ دوسرا لیکچر اکرام چغتائی صاحب نے ''اقبال، گوئٹے اور جرمنی'' کے موضوع پر دیا۔ یہ دونوں لیکچر اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوئج، آرٹ اینڈ کلچر کے مشترکہ تعاون سے منعقد کیے گئے۔ ان لیکچرز میں اقبال شناسوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور انھیں علمی وادبی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ ۳ مئی ۲۰۱۹ء کو اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے خانہ فرہنگ ایران کے تعاون سے ایک ''پاک ایران اقبال کانفرنس'' کا کامیاب انعقاد کرایا جس میں پاکستان اور ایران کے بہت سے اقبال اسکالرز نے مقالات پیش کیے۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایک نشست کا اہتمام کرتا ہے جس میں اقبال پہ کسی نہ کسی موضوع پہ لیکچر دیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت محمد اعجاز الحق مندرجہ ذیل موضوعات پہ لیکچر دے چکے ہیں جو عنقریب اشاعت پذیر ہوں گے۔

۱- اقبال کا تصورِ خودی، چند مابعد الطبیعیاتی و اخلاقی پہلو

۲- اقبال اور کانٹ

۳- اقبال اور ہیگل

۴- اقبال اور شیلنگ

۵- اقبال اور فختے

۶- اقبال کے اقتصادی نظریات

اس ادارے کے مستقبل قریب کے پروگراموں میں اقبال پر ایک وسیع لائبریری کا قیام، اقبال پر معیاری تحقیقی کتب کی اشاعت، اور نومبر میں ایک قومی اقبال

کانفرنس کا انعقاد شامل ہے۔

ایوان اقبال

ایوان اقبال کمپلیکس لاہور میں تعمیر شدہ یادگاری عمارت ہے جو شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے فلسفہ خودی کی شناحت کے طور پر تعمیر کی گئی۔ یہ عمارت علامہ کے فلسفہ اور اُمت کے اتحاد کی خاطر سوچ کے اعتراف میں اقبال اکیڈمی کی جانب سے فراہم کیے گئے سرمائے سے تعمیر کی گئی، اس یادگار کا مقصد اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اقبال اکیڈمی کے مختلف منصوبہ جات کے لیے سرمایہ اکھٹا کرنا ہے۔ فلسفہ خودی کے بارے میں ایوان اقبال میں منعقد ہونے والی تقاریب، نمائشیں اور ہمہ وقت دستیاب علمی وسائل نہ صرف عظیم شاعر کے فلسفے کسوا جاگر کرتے ہیں بلکہ یہ زائرین کے لیے نئی سوچ کے پردے بھی واکرتی نظر آتی ہے۔ حال ہی میں ایک اندازے کے مطابق اس ایوان میں عوام اور علمی حلقوں کی دلچسپی سے ثابت ہوا کہ نہ صرف یہ یادگار اپنے بلکہ دوسرے کئی منصوبوں کے لیے بھی سرمایہ اکھٹا کرنے میں کامیاب رہی۔

ایوان اقبال کمپلیکس ۱۹۹۷ء میں مکمل ہوا اور اس کی تصویر پر ۱۴۱ ملین پاکستانی روپے خرچ ہوئے۔ یہ عمارت ۱۳ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔ اس یادگار کی تعمیر میں کئی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے اپنا حصہ ڈالا۔

بزم اقبال

مفکر پاکستان علامہ اقبال جب رحلت فرما گئے اور ظہور پاکستان کے ساتھ ہی جو علمی و ملی ادارے معرض وجود میں آئے۔ ان میں ایک ادارہ ''اقبال اکیڈمی

’’ ہے۔ایک سال کے بعد اس کا نام ’’بزم اقبال‘‘ رکھ دیا گیا۔اقبال اکیڈمی کا تصور تو حیات اقبال میں ہی پیش کر دیا گیا تھا۔اس حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار رقم طراز ہیں:

’’علامہ شیخ محمد اقبال کی زندگی میں دو بار یوم اقبال منعقد ہوئے۔مولانا راغب احسن کے مضمون کو اس لحاظ سے نمایاں اہمیت حاصل ہے۔جس میں پہلی بار انہوں نے موثر انداز میں اقبال اکیڈمی کے قیام کا تصور پیش کیا گیا تھا۔اقبال کی رحلت کے بعد اس کا شدت سے احساس ہونے لگا۔‘‘

اقبال اکیڈمی کی طرف جب توجہ مبذول ہوئی تو اس کا پہلا جلسہ ۲۵ مئی ۱۹۵۰ء کو عزت مآب ’’شیخ نسیم حسن‘‘ کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔اقبال اکیڈمی کے قیام میں خصوصی توجہ ’’سردار عبدالرب نشتر‘‘ نے فرمائی۔پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر ضروری تھا کہ اقبال چونکہ مصور پاکستان تھے۔ان کی تصنیفات کو اور فرمودات و خیالات سے دنیا کو آگاہ کیا جائے۔اس غرض سے حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا کہ دو لاکھ گرانٹ سے اقبال اکیڈمی قائم کی جائے۔مجلس منتظمہ کا پہلا اجلاس مشیر تعلیم کی صدارت میں ۲۵ مئی ۱۹۵۰ء میں جسٹس ایس۔اے رحمٰن، مسٹر ایم ایم شریف، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سید نذیر نیازی کے سرپرست قائم ہوا۔

اقبال اکیڈمی سے بزم اقبال

۱۹۵۱ء کو جب مجلس منتظمہ کا اجلاس زیر صدارت ایس۔اے رحمٰن ہوا۔جس میں اقبال اکیڈمی کا نام تبدیلی کے بعد ’’بزم اقبال‘‘ رکھنے کا مرحلہ پیش آیا۔نام کی تبدیلی کے باوجود کچھ عرصہ تک مغالطہ رہا۔اقبال اکیڈمی کا ایکٹ تو بنا دیا گیا۔مگر صرف

کاغذوں تک محدود تھا۔۱۹۵۵ء میں صحیح معنوں میں اس کا آغاز ہوسکا۔سرکاری دستاویز اور مجالس دستور میں ''بزم اقبال'' کو''اقبال اکیڈمی'' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں:۔''حضرت علامہ اقبال پر قائم ہونے والا پہلا ادارہ بزم اقبال تھا''۔

بزم اقبال کے قیام کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱- اقبال کے افکار اور تعلیمات پر تحقیقاتی کام کیا جائے۔

۲- عربی،فارسی،اردو،انگریزی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں اقبال پر مفید کتابیں اور فکر اقبال کے کسی موضوع پر مفصل مقالہ شائع کیا جائے۔

۳- اقبال کی حیات اور آثار پر مختلف زبانوں پر مشتمل کتب کی اشاعت۔

۴- اقبال کی انگریزی کتب کا اردو ترجمہ۔

۵- اردو اور انگریزی میں سہ ماہی مجلّہ ''مجلّہ اقبال'' کا اجراء۔

ادارہ بزم اقبال

''مجلّہ اقبال'' کا مقصد علامہ محمد اقبال کی زندگی وشاعری افکار اور علوم فنون کے ان شعبوں کا تحقیقی مطالعہ پیش کرنا تھا۔ جس سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔مثلاً اسلامیات،فلسفہ ادب وفن وغیرہ۔''مجلّہ اقبال'' کا پہلا شمارہ انگریزی میں ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ایک کتابچہ''اقبال اور ملاء'' کے عنوان سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے تالیف کیا۔اس کی مقبولیت اس حد تک ہوئی کہ جولائی ۱۹۵۳ء میں ہی دس ہزار کاپیاں اسی سال چھپوائی گئیں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب ''فکر اقبال''۱۹۵۷ء میں کافی مقبول ہوئی۔

یہ ادارہ حکومت کی سرپرستی میں قائم ہوا اور یہ بھی فیصلہ صادر ہوا کہ بزم اقبال خود مختار ادارے کی حیثیت سے کام کرے گی۔ ۱۹۶۰ء میں بزم اقبال کی سالانہ گرانٹ پچیس ہزار کردی گئی۔ جو بزم کے علمی اشاعتی مقاصد کے لیے ناکافی تھی۔ یہ خود مختار ادارہ شروع سے زیر تعلیم سے وابستہ رہا۔ بزم اقبال کے ساتھ ''مجلس ترقی ادب'' اور ترجمہ بورڈ (ادارہ ثقافت اسلامیہ) اقامت گزیں تھے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۸۷ء کو ڈاکٹر وحید قریشی نے مقتدرہ قومی زبان کی صدر نشینی سے سبکدوش ہوکر بزم اقبال کی سیکرٹیری شپ کا منصب سنبھالا۔

ان کی آمد سے بزم اقبال کی خود انحصاری کے اس عمل کو فروغ ملا۔ اور مزید فروغ کی توقع ہوئی۔ جس کا آغاز احمد ندیم قاسمی کی اعزازی معتمدی کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ ادارہ ایک عرصہ تک غیر فعال رہا۔ کیونکہ اس کی گرانٹ ناکافی تھی۔ پہلے تیس برس میں بزم اقبال نے کل ۷۴ کتب شائع کیں تھیں۔ اس کے بعد اشاعتی کام جتنا تیزی سے ہوا بعد میں مدھم ہوگیا کیونکہ اس ادارے کی مالی حالت بخش نہ تھی۔ طباعت کے اخراجات بڑھ چکے تھے۔ موجودہ گرانٹ بھی ناکافی تھی۔ جس کا قابل لحاظ عملے کی تنخواہ کے سالانہ اضافوں میں صرف ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ ادارہ مقروض بھی رہا۔ عملے کو تنخواہ ادا کرنے کی بھی رقم نہ تھی۔ ان وجوہات پر حکومت نے بزم اقبال کو سابقہ واجبات کی ادائیگی پر بزم اقبال کی گرانٹ کو دوگنا کردیا۔ اور ۶ لاکھ گرانٹ کا اضافہ ہوا۔ اور اس میں تخفیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۲۰۰۰ء میں جب اقبال ''گولڈن جوبلی'' کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ سالانہ گرانٹ میں ایک تہائی تخفیف ہو چکی تھی۔ بزم اقبال کو خصوصی گرانٹ ۱۹۹۲ء میں دی گئی۔ جس سے کتب کی اشاعت میں مزید اضافہ ہوا۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

''ڈاکٹر وحید قریشی اس قابل ہو گئے کہ ڈھیروں کتب چھاپ سکیں۔'' یہ الگ بات ہے کہ ان کتب میں کچھ معیاری اور کچھ غیر معیاری تھیں۔
۱۹۹۴ء کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اعزازی سیکرٹری کے طور پر بزم اقبال کا چارج سنبھالا۔ بزم اقبال کو فروغ دینے اور اقبال کی کتب اور فرمودات کی اشاعت کے لیے جن شخصیات نے اہم کردار کیا۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:

شیخ نسیم حسن، شیخ عبدالرحمٰن، چوہدری علی اکبر، ڈاکٹر عبدالخالق، ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر سلیم اختر۔

وائس چیرمین جسٹس ایس۔اے رحمٰن ۱۹۵۰ء تا ۱۹۷۳ء تک جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۷ء تک پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرام ۱۹۹۹ء تا حال تک وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

اعزازی معتمد سیکرٹری:۔ جن حضرات نے بزم اقبال میں بطور سیکرٹری اہم فرائض سرانجام دیئے ان میں ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں، سید امتیاز علی تاج، کریم الدین احمد، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور پروفیسر محمد حنیف شاہد ۲۳ مارچ ۲۰۱۳ء سے تا حال تک اپنے فرائض سے منسلک ہیں۔

بزم اقبال کی شائع کردہ کتب:۔

چند اہم تصنیفاتِ اقبال مندرجہ ذیل ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال (خلافت اسلامیہ)، شیخ علامہ محمد اقبال (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر مع اصل متن انگریزی)، سید نذیر نیازی (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) علامہ

اقبال کے فکروفن پر بہت سی کتب شائع کی گئیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

پروفیسر محمد فرمان (اقبال اور تصوف)، مرتبہ: افضل حق قریشی (اقبال کا فکر و فن)، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (اقبال کا ذہنی ارتقاء)، مرتبہ گوہر نوشاہی (ایران نامہ)، اور پروفیسر جابر علی سید (اقبال ایک مطالعہ) انتخاب مقالات میں اہم کتب شمار ہوئیں ہیں۔

اقبال کے حوالے سے بہت سی کتب شائع ہوئیں اُردو کے علاوہ انگریزی زبان میں ۳۳ کتب شائع ہوئیں۔ گرانٹ کی کمی کے باعث تمام تر محرومیوں اور وسائل کی کمی کے باوجود بزم اقبال نے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب کا نام اور اس کی مصنفہ ''اقبال اور رومانویت از ڈاکٹر عظمت رباب'' ہے۔ ادارے میں سکیل نمبر ا سے لے کر سکیل نمبر ۱۷ تک کے ۱۰ ملازمین خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بزم اقبال کا مقصد اقبال کی تمام تعلیمات وفرمودات کو یک جا کر کے انکی اشاعت کرنا اور اقبال جیسی شخصیت جو مصور پاکستان ہیں ان کو دنیا کے گوشے گوشے میں عام کیا جائے۔ ان کی تعلیمات وفرمودات کو آج دنیا کے گوشے گوشے تک رسائی ہے۔ بحث تقریر وتحریر اور تحقیق کے ذریعے ان کے پیغام کو عوام تک پہنچایا گیا۔

تصنیفی خدمات کے لیے خصوصی اسکالرز کا انتخاب کیا گیا۔ جن میں سے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وانوار حسین اکبر حسین قریشی، بشیر احمد ذار ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو علامہ اقبال کی ''سوانح حیات'' کے مواد کی فراہمی کا کام تفویض کیا گیا۔ ڈاکٹر حسین قریشی نے کچھ عرصہ تک ''تلیحات اقبال'' پر کام کیا۔ کتابوں کیتصنیف وتالیف کا کام صبر آزما بھی ہوتا ہے اور وقت طلب بھی۔ علاوہ ازیں ''مجلّہ اقبال'' اُردو اور انگریزی

دونوں شمارے شائع ہوتے ہیں۔ ''مجلّہ اقبال'' کا مقصد علامہ اقبال کی زندگی شاعری و افکار اور علوم وفنون کے ان شعبوں کا تحقیقی مطالعہ ہے۔ جن سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

ایک بنیادی نوعیت کا کام علامہ اقبال کی سوانح حیات کی ''تدوین'' کا تھا۔ جس پر گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے بزم اقبال کو خصوصی طور پر ہدایات دی تھیں۔ ڈاکٹر چغتائی کو علامہ اقبال ماسٹر چغتائی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ اقبال کے سفر وخضر اور خلوت وجلوت میں ان کے رفیق خاص تھے۔ اور علامہ اقبال کے واقعات کے عینی شاہد تھے۔ تالیفات کے سلسلے کا دوسرا اہم منصوبہ علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اُردو ترجمہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کی تکمیل و اشاعت تھا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ یہ ترجمہ ''جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر سید عابد حسین'' کریں۔ مگر انہوں نے بوجہ مصروفیت معذوری کا اظہار کیا۔ تو قرعہ فال سید نذیر نیازی کے نام پڑا۔ ادارہ ''بزم اقبال'' نے صرف اقبال پر کام کیا۔ اور ابھی بھی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اس کا مقصد اقبال جیسی شخصیت کو دنیا میں روشناس کروانا تھا۔ اور ان کے علوم وفنون عوام تک پہنچانے تھے۔ جو یہ ادارہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی کتب اور دیگر کتب شائع کرنا اس کا مقصد نہ تھا۔ اور آج دنیا میں اقبال پر جتنا کام ہوا۔ شاید ہی کسی اور شاعر پر کام ہوا ہو۔ بزم اقبال اپنے خشوع وخضوع سے اپنی خدمات و منصب میں سرگرم عمل ہے۔

ثقافت اسلامیہ

صدیوں سے علم وثقافت کا مرکز رہنے والے لاہور کی مرکزہ شاہراہ قائداعظم جو مال روڈ کہلاتی ہے۔ دیگر کئی علمی اداروں کے ساتھ ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' کا دفتر بھی

ہے۔''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔اس ادارہ کا قیام پاکستان وجود میں آنے کے تین سال بعد عمل میں آیا۔

اغراض ومقاصد: پس منظر:

اس کے قیام کی وجہ یہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی خاص طور پر مسلمانوں کے اہل فکر اور صاحب فکر طبقہ کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں تھیں۔ادارہ ثقافت اسلامیہ ایک خاص علمی اور ثقافتی ادارہ ہے۔وہ کسی مکتب خیال سے جنگ نہیں کرنا چاہتا لیکن ہر مکتب خیال تک اپنی آواز ضرور پہنچانا چاہتا ہے۔یہ ادارہ کسی خاص مسلک یا عقیدے کا داعی نہیں۔

اس کے قیام کا سب سے بڑا مقصد مسلم علوم وفنون کو جدید ذہن کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنا تھا۔تاکہ وطن عزیز کی نئی نسلوں کے شعور وفہم کو نظریاتی آہنگ دیا جاسکے۔یہ ادارہ اس غرض سے قائم کیا گیا کہ اسلامی علوم اور تہذیب وتمدن کے مختلف پہلوؤں کا تحقیقی مطالعہ ہو سکے۔اور حالات حاضرہ کی روشنی میں اسلامی فکر وخیال کو اس طرح پیش کیا جائے کہ قومی زندگی میں اصلاح وترقی کی بھی پوری گنجائش رہے اور یہ ارتقا عین اسلامی روح کے مطابق ہو۔یہ پہلا اداہ ہے۔جس کا مقصد ایک خاص پروگرام کے تحت اسلامیات پر اہم کتابیں شائع کرنا۔فقہ جدید کی طرف کامیابیاں اور متوازن قدم اٹھانے کے لیے اور اسلام کی تشریح نو کے سلسلے میں صحت منداور متوازن راہنمائی فلسفہ،اخلاق،معاشرت،اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی رواداری اور تہذیب وتمدن کے نقوش کو روشن کرنا ہے۔

ادارے کی ابتداء:

پاکستان کی تعمیر نو آسان نہ تھا۔اس کے لیے ایسے ذہنوں کی ضرورت تھی جو قدیم وجدید کی مشکلات اور مشرق ومغرب کی وسعتوں سے آشنا ہوں۔ادارے کے قیام میں سب سے پہلے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا تاحیات صدر نشین جناب ''سید واجد علی شاہ'' کو مقرر کیا گیا۔اوراس کے سب سے پہلے مینجنگ ڈائریکٹر'' جناب عبدالحکیم مرحوم'' بنے۔ان بزرگوں نے تحقیق واشاعت کی ایک گراں قدر روایت ڈالی۔اسلامی علوم و فنون کی نشاۃ الثانیہ کے لیے اصحاب علم کی ضرورت تھی۔خلیفہ صاحب کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ادارے کے قیام کے بعد دشوار ترین مرحلہ رفقائے کار کے انتخاب کا پیش آیا۔ایسے حضرات ملتے تھے۔جو عصر حاضر کی ضروریات سے ناآشنا تھے۔اور پھر مشکل کے ساتھ ایسے اصحاب اکٹھا ہوگئے جن میں ایم ایم شریف، جناب شیخ محمد اکرام،مولانا محمد حنیف ندوی، جناب سراج منیر، پروفیسر حمیداللہ خاں، جناب رئیس احمد جعفری، شاہد حسین رزاقی ،مولانا محمد اسحاق بھٹی مرحوم اور پروفیسر مظہر الدین صدیقی شامل ہیں۔اس عرصے میں ادارہ نے عقائد، اخلاق، سیاست، تصوف اور تعلیم وتمدن کے متعلق کم وبیش سوا سو کتابیں شائع کیں۔

کتابوں کی اشاعت:

۱۹۵۷ء میں کل تعداد ۲۶ تھیں جو شائع ہوئیں اُردو زبان میں ۷ اور انگریزی میں ۱۰ جبکہ کچھ کتابیں ترجمہ تھیں جن میں ۹ کتابیں شامل ہیں۔۱۹۶۰ء میں دوسری فہرست سامنے آتی ہے۔جن میں کل تعداد ۳۸ ہے۔اپریل ۱۹۶۶ء تک اسلامی کتب کی تعداد ۶۷ ہے۔اور انگریزی میں اسلامی کتابوں کی تعداد ۲۲ ہے۔اور ۱۹۶۶ء کے

بعد ۴۷ سے اوپر تجاوز کر گئی۔۱۹۸۰ء میں ادارے کی شائع کردہ کتب کی تعداد دوسو سے متجاوز کر گئی۔ادارے کی بہت سی مطبوعات یونیورسٹی اور کالج کی سطح پر مددگار کی حیثیت سے نصاب میں شامل ہوتی ہیں۔۲۰۱۶ء کی فہرست مطبوعات کے مطابق ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں کی کل تعداد ۲۴ ہے۔جبکہ ۲۰۱۷ء میں تین س کے لگ بھگ شائع ہو چکی ہیں۔ ملک کے چیدہ اسکالرز کے علاوہ ادارے کو بین الاقوامی سطح کے مفکرین کی نگارشات شائع کرنے کا شرف حاصل ہے۔گذشتہ ۶۷ برسوں میں ادارے کی مطبوعات نے مسلم تہذیبی شعور کی تربیت اور فروغ میں قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔

لائبریری:

ادارے کی لائبریری کی کتابوں کی مجموعی تعداد ۵۲ ہزار سے زیادہ ہے۔ان کتابوں کے زیادہ تر موضوعات مذہبیات،فلسفہ،تاریخ،ادبیات اور تہذیب وثقافت کے موضوعات پر مبنی ہیں۔

ماہنامہ ثقافت: المعارف

ترجمان ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۵ء اشاعت کتب کے علاوہ ادارہ ''المعارف'' کے نام سے علمی اور تحقیقی مجلّہ بھی شائع کرتا ہے۔جنوری ۱۹۵۵ء میں اس کا اجراء ''ثقافت'' کے نام سے ہوا۔۱۹۸۶ء میں اس کا نام بدل کر ''المعارف'' رکھ دیا گیا۔''المعارف'' ماہنامہ کے طور پر شائع ہوا کچھ مشکلات کے باعث ۲۰۰۹ء سے یہ جریدہ ماہوار کے بجائے شمشاہی بنیاد پر باقاعدگی سے قارئین تک پہنچ رہا ہے۔اس میں اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی تصورات پر متوازن اور ذمہ دارانہ مضامین شائع

ہوتے ہیں۔اس کے موجودہ ایڈیٹر قاضی جاوید ہیں۔

اس کے علاوہ ادارہ سیمینارز اور جلسے بھی کرواتا ہے۔جن میں اعلیٰ سطح مضامین پڑھے جاتے ہیں اوراس کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم کی یاد میں سالانہ یادگاری خطبہ کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔اس کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم میموریل لیکچر کی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔اس ادارے کے ناظمین میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،میاں ایم ایم شریف،ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، جناب شیخ محمد سعید اور جناب سراج منیر شامل ہیں۔

ادارے کے مصنّفین

ابتدا ہی سے ادارے کو وطن عزیز کے نامور سکالرز اور اہل قلم کا تعاون حاصل رہا ہے۔جن میں پروفیسر محمد سرور، ڈاکٹر منظور احمد، پروفیسر محمد احمد خاں، ڈاکٹر ایوب قادری، سید ظفر الحسن عبدالحق، جسٹس ایس۔اے رحمٰن، مولانا محمد مظہر الدین اور شیخ محمد اکرام شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مشہور و معروف فلسفی شاعر، نقاد، محقق، ماہر اقبال، ماہر غالبیات اور مترجم تھے۔ان کی تصنیفات میں قابل ذکر فکر اقبال، مقالات حکیم و حکمت رومی اور افکار غالب شامل ہیں۔مولانا حنیف ندوی انہوں نے پندرہ کتابیں تصنیف کیں۔جن میں چہرہ نبوت، مطالعہ قرآن، قدیم یونانی فلسفہ، مطالعہ حدیث اور افکار ابن خلدون وغیرہ شامل ہیں۔رئیس احمد جعفری مورخ، ناول نگار، ماہر اقبالیات ان کی کتابوں کی تعداد تین سو سے زائد ہے جن میں تاریخ تصوف، غزالی نامہ، اقبال اپنے آئینے میں، اقبال اور عشق رسول ﷺ وغیرہ شامل ہیں۔اس ادارے سے بہت سی عمدہ اور مستند کتابیں شائع ہوئیں۔ جو بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہیں۔لیکن یہ ایک غیر سرکاری ادارہ ہونے کے باوجود اپنی مدد آپ کے تحت عمدہ

کتابیں شائع کر رہا ہے۔اپنے بل بوتے پر چلنے والا یہ ادارہ آج پاکستان میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی

علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی کا آغاز ۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو ہوا۔ابتدا میں اس تنظیم نے حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی شخصیت پر جاری ہونے والی ڈاک ٹکٹوں اور ڈاک سے متعلقہ اشیاء کے ذخیرے کو عوام الناس میں نمائش کیا۔اس سلسلہ کی پہلی نمائش ۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو علامہ اقبال کے مزار پر منعقد کی گئی۔پھر یہ تسلسل کے ساتھ یہ سرگرمی بڑھتی رہی۔علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی کے روحِ رواں میاں ساجد علی ہیں جنہوں نے اقبالیات کا یہ ذخیرہ نہ صرف جمع کیا بلکہ شاعر مشرق کی شخصیت اور افکار کو فروغ دینے کے لیے کئی مرتبہ نمائش بھی کیا۔اس تنظیم نے اب تک ۳۸ مرتبہ اس ذخیرہ کو پاکستان کے مختلف شہروں اور تعلیمی اداروں میں نمائش کے طور پر منعقد کیا جا چکا ہے۔مفکرِ پاکستان پر ڈاک ٹکٹوں اور ڈاک سے متعلقہ اشیاء کا دُنیا بھر میں سب سے بڑا ذخیرہ اس تنظیم کے چیئرمین' میاں ساجد علی کے پاس محفوظ ہے۔علامہ اقبال پر جمع کیے گئے اس ذخیرہ کو چھ مرتبہ قومی سطح کی ڈاک ٹکٹوں کی نمائشوں پر میڈلز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔میاں ساجد علی کی درخواست پر پاکستان کے محکمہ ڈاک نے تین مرتبہ ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیے جن میں پہلا ڈاک ٹکٹ ۲۱ اپریل ۲۰۱۳ء کو علامہ اقبال کے ۷۵ ویں یومِ وفات پر جاری کیا گیا۔جبکہ دوسری مرتبہ پاکستان پوسٹ نے ترکی کے ساتھ ایک مشترکہ سووینیئر شیٹ (Souvenir Sheet) کا اجرا ۹ نومبر ۲۰۱۷ء کو کیا' جس پر دونوں ممالک کے قومی شعراء کی تصاویر شائع کی گئیں۔تیسرا ڈاک ٹکٹ ۱۵ فروری

۲۰۱۹ء کو مرزا اسداللہ خاں غالب کے ۱۵۰ ویں یومِ وفات پر جاری کیا گیا۔ آپ کی کاوشوں سے اقبال سنگھ سیویا نے اپنی کتاب The Political Philosophy of Muhammad Iqbal: Islam and Nationalism in Late Colonial India کے سرورق پر پاکستان کا ایک ڈاک ٹکٹ بطور ڈیزائن شائع کیا' جس میں علامہ اقبال کو خطبہ الٰہ آباد دیتے دکھایا گیا تھا۔ یہ کتاب اس اعتبار سے اوّلین کتاب تھی جس کے سرورق پر علامہ محمد اقبال پر جاری ہونے والے ڈاک ٹکٹ کی تصویر کو چھاپا گیا تھا۔ اس کتاب کو کیمبرج یونیورسٹی پریس نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا تھا۔ اقبالیات کے اس منفرد کام پر فرزندِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا تھا کہ ''میرا اقبالیات کا ساٹھ سالہ تجربہ ہے لیکن جس انداز سے آپ نے اقبال کے اس پہلو کو اُجاگر کیا ہے ہم نے کبھی اس طرف سوچا ہی نہیں''۔ میاں ساجد علی کی اس موضوع پر ایک کتاب Naqsh-o-Nigar-e-Iqbal بھی شائع ہو چکی ہے۔ جسے برجر پینٹس پاکستان لمیٹڈ نے نومبر ۲۰۱۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب کو دو مرتبہ قومی سطح کی ڈاک ٹکٹوں کی نمائشوں میں ایوارڈز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی اب باقاعدہ طور پر ایک تنظیم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جس نے دو کتب شائع بھی کیں۔ اوّل ''منتشر خیالاتِ اقبال'' جو کہ علامہ اقبال کی انگریزی بیاض Stray Reflections کا اُردو ترجمہ ہے' کو نومبر ۲۰۱۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس انگریزی بیاض کا اُردو ترجمہ میاں ساجد علی نے کیا تھا۔ جس پر بعد ازاں ۲۰۱۹ء میں اورینٹل کالج' پنجاب یونیورسٹی' لاہور میں ایم فل اُردو کا تحقیقی مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ دوم ''نگاہِ اقبال میں شانِ فقر'' یہ کتاب علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی

نے جون ۲۰۱۶ء میں شائع کی تھی۔علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پہلی مرتبہ کسی غیر سرکاری تنظیم نے اقبالیات پر شائع ہونے والی کتب پر ایوارڈ کا اجرا بھی کیا۔اس ضمن میں پہلا ایوارڈ ۱۹۔۲۰۱۸ء میں علامہ اقبال کی شخصیت، فکر اور شاعری پر شائع ہونے والی کتب میں بہترین کتاب پر 'مباحث خطباتِ اقبال: تشریحات کے ساتھ' از پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف خان کو دیا گیا۔باقی کتب کے مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے اسناد بھی جاری کی گئیں۔اقبالیات پر کام کرنے والے مصنفین کے لیے یہ ایک اچھا اقدام ہے جسے اقبالیاتی حلقہ میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی نے فروغ فکرِ اقبال کے لیے مضمون نویسی کا مقابلہ بھی منعقد کروایا۔یہ مقابلہ ۲۰۱۹ء میں بعنوان ''علامہ اقبال اور عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے عنوان پر تھا۔جس میں پہلی پانچ پوزیشن پانے والے شرکاء کو نقد انعام کے ساتھ ساتھ شیلڈز، کتب اور اسناد بھی دی گئیں جبکہ باقی تمام شرکاء کو اسناد جاری کی گئیں۔فکرِ اقبال کو فروغ دینے کا سلسلہ یہیں نہیں رُکا بلکہ اقبالیاتی ادب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ''تمغہ حاصلِ حیات'' Life Time Achievement Award کے اجرا کا سہرا بھی اسی تنظیم کو جاتا ہے۔یہ ایوارڈ اُن شخصیات کے لیے مختص ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ فروغِ اقبالیات کے لیے بسر کیا۔اس ضمن میں پہلا ایوارڈ ۲۰۱۹ء میں جناب امیر حسین صاحب کو دیا گیا۔

سوشل میڈیا کے اس دور میں فکرِ اقبال کا فروغ نسلِ نو میں انتہائی ضروری ہے اس حوالے سے بھی اس تنظیم کے بانی میاں ساجد علی سرگرم ہیں اور روزانہ علامہ اقبال سے متعلقہ شخصیات کے تعارف اور کاموں کو اُجاگر کرتے رہتے ہیں جس سے محققین

کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے جس میں دوسری کتب کے ساتھ ساتھ اقبالیات پر شائع ہونے والی کتب کو خصوصی طور پر رکھا گیا ہے۔ صرف اقبالیاتی ادب پر کتب کی تعداد ساڑھے سات سو سے تجاوز کر چکی ہے۔ علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی کے پاس ذخیرہ میں محفوظ ڈاک ٹکٹوں کے علاوہ شاعر مشرق کے خانوادہ کی ہاتھ لکھی تحریریں اپنی اصل حالت میں موجود ہیں جن میں آفتاب اقبال، جاوید اقبال، رشیدہ بیگم، شیخ اعجاز احمد، علی بخش، غلام محمد (علی بخش کا بھتیجا)، آزاد اقبال وغیرہ کے خطوط اور تحریری مسودے شامل ہیں۔ علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی نے اقبال پر ہونے والی کانفرنسوں، سیمینارز، اجلاسوں پر شائع ہونے والی مختلف اشیاء کو بھی جمع کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کی شخصیت پر شائع ہونے والے عیسوی سال کے کیلنڈرز کی بھی ایک اچھی تعداد اس تنظیم کے پاس محفوظ ہے۔

اقبال سے عقیدت میں جمع کی جانے والی اشیاء کے علاوہ اقبالیاتی ادب پر بھی میاں ساجد علی نے مضامین تحریر کیے ہیں۔ جن میں ۳۶ مضامین اُردو میں جبکہ پانچ مضامین انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب اس تنظیم کے سربراہ نے بچوں میں اقبالیات کے فروغ کے لیے علامہ اقبال کے ایک مصرع پر سبق آموز کہانیاں لکھنے کا بھی بیڑا بھی اُٹھایا ہے۔ اور اب تک تین سبق آموز کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ اس تنظیم کی جانب سے میاں ساجد علی نے تین کانفرنسوں میں بھی علامہ اقبال کی فکر کو فروغ دینے کے لیے اپنے تحقیق مقالات بھی پڑھے ہیں۔ علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی نے نسلِ نو میں افکارِ اقبال کے فروغ کے لیے کئی تعلیمی اداروں میں معلوماتی اجلاسوں کا بھی انعقاد کیا ہے۔

مجلس ترقی ادب، لاہور

مجلس ترقی ادب لاہور میں قائم پاکستان کا ایک علمی و ادبی ادارہ ہے جو حکومت پنجاب کے ماتحت کام کرتا ہے، جس کا مقصد اردو کے کلاسیکی ادب اور علوم انسانی پر تالیفات و تراجم شائع کرنا ہے۔ یہ ادارہ جولائی ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا۔اس ادارے کے موجودہ ناظم اردو کے ممتاز ادیب، نقاد، شاعر اور محقق ڈاکٹر تحسین فراقی ہیں۔اس ادارہ کا علمی جریدہ صحیفہ کے نام سے شائع ہوتا ہے جو ۱۹۵۷ء سے تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔مجلس ترقی ادب، لاہور نے اقبال بحیثیت شاعر، مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (طبع دوم)، اقبال اور عبدالحق (مکتوبات اقبال کی روشنی میں، مرتب: ممتاز حسن (طبع دوم)، معاصرین اقبال کی نظر میں، از عبداللہ قریشی (طبع دوم)، اقبال کا تصور زمان و مکاں اور دوسرے مضامین از ڈاکٹر رفیع الدین صدیقی (طبع سوم)، شذرات فکر اقبال، مرتب، ڈاکٹر جاوید اقبال، مترجم: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (طبع دوم)، اقبال کی تیرہ نظمیں، از اسلوب احمد انصاری (طبع دوم) شائع کر کے اقبالیات کے حوالے سے خاطر خواہ خدمات سرانجام دیں ہیں۔نجی سطح کے اشاعتی مراکز نے علامہ محمد اقبال کی شاعری، شخصیت اور فکر و فن پر جو کتابیں چھاپی ہیں وہ اقبالیات کے ضمن میں ایک بیش قیمت خزانہ ہے، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور کلیات اقبال اُردو (معہ اشاریہ)، کلیات اقبال فارسی (معہ اشاریہ)، بانگ درا، بال

جبریل، ضرب کلیم بمعہ ارمغان حجاز (اُردو)، ارمغان حجاز (فارسی)، اسرار و رموز (فارسی)، پیام مشرق (فارسی)، زبور عجم (فارسی)، جاوید نامہ (فارسی)، پس چہ باید کرد (فارسی)، جمہوری پبلی کیشنز لاہور، بک کارنر جہلم، نگارشات پبلشرز

لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، دعا پبلی کیشنز لاہور، مکتبہ جدید لاہور، کتاب سرائے لاہور اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شعبہ اقبالیات میں نمایاں، دیدہ زیب اور منفرد کتب چھاپ کر عوام کے سامنے پیش کی ہیں۔

مقالات

لاہور کی جامعات میں اقبال شناسی کے عنوان کے تحت ایم۔اے، ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کے مقالات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔اس فہرست کی تیاری میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی کتاب ''جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ایک جائزہ''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول، ۱۹۷۷ء اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی مرتبہ ''جامعات میں اُردو تحقیق''، مطبوعہ اسلام آباد: ہائر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۰۰ء سے مدد لی گئی ہے۔وہ مقالات جو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی کتاب ''جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ایک جائزہ'' اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ''جامعات میں اردو تحقیق'' کے بعد لکھے جاتے رہے اُن سے آگاہ ہونے کے لیے مختلف جامعات میں موجود مقالات کی فہرستوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ جو مقالات کی فہرست دی گئی ہے اُسے بالترتیب ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔فہرست میں موجود چند مقالات کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہر حصے میں مقالہ نگاروں کے ناموں کی الف بائی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

مقالات برائے ایم۔اے

۱۔ ابر النساء۔مصطلاحات ''جاوید نامہ''۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۴ء۔
[زیرِ نگرانی: ڈاکٹر سید محمد اکرم]

۲۔ اختر سلطانہ،سیدہ۔مکالماتِ اقبال کا تجزیہ۔لاہور :پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء۔[زیرنگرانی:سیدوقارعظیم]

۳۔ افسرہ،بلقیس جمال۔ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کے موضوعات کا تنقیدی مطالعہ۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۵ء۔[زیرنگرانی:ڈاکٹر وحید قریشی]

۴۔ افسرہ،بلقیس جمال، "Iqbal,s theory of knowledge and its implications for education''۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۷ء[زیرنگرانی:ڈاکٹرممتازاحمدبھٹی]

۵۔ امتیاز بانو۔اقبال کا تصور دوام۔ لاہور:پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۶ء۔[زیر نگرانی:نعیم احمد]

۶۔ انورسلطانہ۔اقبال کی فنی ترکیب۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۶ء۔[زیر نگرانی:سیدوزیرالحسن عابدی]

۷۔ تابندہ نذیر۔اقبال اورتہذیبِ مغرب۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی۔۱۹۷۱ء۔ [زیرنگرانی:ڈاکٹرافتخاراحمدصدیقی]

۸۔ تسنیم فردوس۔اقبال اور افغانستان۔لاہور :پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۴ء۔[زیرنگرانی:ڈاکٹرسیدمحمداکرم شاہ]

۹۔ ثمینہ ناز۔"اقبال ریویو" کی وضاحتی فہرست (جنوری ۱۹۶۸ء۔اکتوبر ۱۹۷۵ء)۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۵ء۔[زیرنگرانی:ڈاکٹرافتخاراحمد صدیقی]

۱۰۔ حذافت آراء۔عورت۔اقبال کی نظر میں۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۲ء۔ [زیرنگرانی:علاءالدین صدیقی]

۱۱۔ حریت ناصر۔ اقبال کی امیجری۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۸ء۔ [زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

۱۲۔ حسن بانو۔ اقبال کے افکار و نظریات خطوط کے آئینے میں۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء۔ [زیر نگرانی: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی]

۱۳۔ حمیدہ ملک۔ اقبال کی اُردو غزل۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء۔ [زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

۱۴۔ حمیدہ نجم۔ اقبال کے سیاسی نظریات۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء۔ [زیر نگرانی: امان اللہ خاں]

۱۵۔ خالدہ بہار۔ "Iqbal on time"۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۸ء۔ [زیر نگرانی: خواجہ غلام صادق]

۱۶۔ خانم، فرزانہ فہیم۔ اقبال اور اجتہاد۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۸ء۔ [زیر نگرانی: بشیر احمد صدیقی]

۱۷۔ خدیجہ۔ اقبال کی شاعری کا فنی پہلو۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء۔ [زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

۱۸۔ راشدہ شیخ۔ اقبال اور فرنگیت۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء۔ [زیر نگرانی : ڈاکٹر عبید اللہ خاں]

۱۹۔ رفعت یعقوب۔ اقبال کے معاشی نظریات۔ لاہور: پنجا ب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء۔ [زیر نگرانی: ڈاکٹر رفیق احمد]

۲۰۔ ریحانہ نسرین دارا۔ کلامِ اقبال میں تاریخی شخصیتیں۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔ [زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

۲۱۔ زاہدہ نزہت۔وضاحتی فہرست سہ ماہی ''اقبال'' (جولائی ۱۹۵۲ء۔اکتوبر ۱۹۵۹ء)لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۷ء

۲۲۔ زرینہ احمد علی۔اقبال اور مناظر قدرت۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۴ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر سید عبداللہ]

۲۳۔ زرین اختر زیدی۔ وضاحتی فہرست سہ ماہی ''اقبال'' (جنوری ۱۹۶۰ء۔اپریل ۱۹۶۷ء)۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۷ء۔[زیر نگرانی: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار]

۲۴۔ سعادت سلطانہ۔اقبال کے اُردو کلام میں طنز و مزاح۔لاہور : پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۴ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی]

۲۵۔ سلیقہ خاتون۔اقبال کی شاعری میں فرد اور جماعت کا تصور۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۷ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار]

۲۶۔ شائستہ خانم۔اقبال کے افکار ونظریات ملفوظات کے آئینے میں۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۵ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی]

۲۷۔ شکیلہ نور جہاں،بانگ درا کا تنقیدی تجزیہ۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۳ء۔[زیرنگرانی: سید وقار وعظیم]

۲۸۔ شمیم ملک۔اقبال کی قومی شاعری۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۰ء۔[زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

۲۹۔ شہناز ہرل۔اقبال کا تصور خدا۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۷ء۔[زیر نگرانی: خواجہ غلام صدیق]

۳۰۔ صفورا سلطانہ۔مکاتیبِ اقبال کا فکری و فنی پہلو۔لاہور: پنجاب

یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر سید عبداللہ]

۳۱۔ طاہرہ صدیقہ۔اقبال شناسی میں خواتین کا کردار۔لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء۔۲۰۰۵ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر سہیل احمد خاں]

۳۲۔ طاہرہ عطا۔مثنوی اسرارِ خودی کا تنقیدی مطالعہ۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی]

۳۳۔ طاہرہ نسیم۔ "The Metaphysical concept of Evolution in Miskawaih ,Rumi and Iqbal"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء۔[زیرنگرانی: خواجہ غلام فرید]

۳۴۔ عاصمہ فرحت۔اقبال کے اُردو کلام میں اسلامی تلمیحات۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر عبید اللہ خاں]

۳۵۔ عائشہ ضیاء۔ The concept of individuality in Iqbal and "Kierkegaard"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔[زیرنگرانی: نعیم احمد]

۳۶۔ عذرا سلطانہ۔اقبال کے سیاسی نظریات۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء۔[زیرنگرانی: سید وقار عظیم]

۳۷۔ عذرا نسرین۔"Iqbal's defence of religion"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۸ء۔[زیرنگرانی: خواجہ غلام صادق]

۳۸۔ عصمت افزاء۔اقبال کے نظام فکر میں عورت کا کردار۔لاہور پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر وحید قریشی]

۳۹۔ فاخرہ شیرازی۔ "A comparative study Nietzsche's perfect man"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء [زیرنگرانی: وحید

اللہ دوائن، عبدالخالق]

۴۰۔ فاخرہ گیلانی۔کلامِ اقبال میں رومانی عناصر۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی]

۴۱۔ فخر النساء۔ "Contribution of Iqbal to the creation of Pakistan"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۵۸ء۔[زیرنگرانی: شوکت علی]

۴۲۔ فرحت یاسمین۔ اردو نظم میں اقبال کا مرتبہ۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر وحید قریشی]

۴۳۔ فرح سلطانہ۔ "A study in Iqbal's Moral philosophy"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء۔[زیرنگرانی: ایم۔ سعید احمد شیخ]

۴۴۔ فریدہ مفتی۔اقبال کا ذہنی ارتقاء۔لاہور : پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۲۶ء۔[زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

۴۵۔ فصیحہ سلطان۔باقیاتِ اقبال۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء۔[زیر نگرانی: ڈاکٹر ناظر حسین زیدی]

۴۶۔ کلثوم اختر چوہدری۔ "Iqbal and some Modern critics of Religion"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء [زیر نگرانی : ڈاکٹر محمد معروف]

۴۷۔ گیتی آراء۔اردو مکتوب نگاری۔غالب سے اقبال تک۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۴ء۔[زیرنگرانی: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار]

۴۸۔ شمیم افزالون۔اقبال اور شیطان۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء۔[زیر

نگرانی: حفیظ اختر]

۴۹۔ مہ جبیں۔اقبال اور کشمیر۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۴ء۔[زیر نگرانی: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی]

۵۰۔ نیر جہاں نامی۔اقبال کی ملی شاعری لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۴ء۔[زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

۵۱۔ ناہید طلعت۔"اقبال ریویو" کی وضاحتی فہرست (جنوری ۱۹۶۰ء۔اپریل ۱۹۶۷ء)۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء۔[زیر نگرانی: ڈاکٹر ناظر حسین زیدی]

۵۲۔ نبیلہ صمد۔اقبال کا نظریہ ء فن۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۳ء۔[زیر نگرانی: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی]

۵۳۔ نسرینہ طاہرہ۔پنجاب کی سیاست میں علامہ اقبال کا کردار (۱۹۲۶ء۔۱۹۳۸ء)۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء۔[زیر نگرانی: سید علی عباس]

۵۴۔ نسرین گل۔اقبال کی شاعری میں تصور ابلیس۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء۔[زیر نگرانی: ڈاکٹر وحید قریشی]

۵۵۔ نسیم اختر۔فکر اقبال میں فلسفہ ء امتزاجیت کا ایک جائزہ۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء۔[زیر نگرانی: منور ابن صادق]

۵۶۔ یاسمین سلطانہ۔اقبال کی طویل نظموں کا تجزیہ۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۴ء۔[زیر نگرانی: سید وقار عظیم]

مقالات برائے ایم فل

۱۔ سعدیہ نورین۔کلام ِ اقبال کے منظوم پنجابی تراجم۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی،۲۰۰۵ء۔[زیرِنگرانی:فخرالحق نوری]

۲۔ صبامرزا،افکارِاقبال کے حوالے سے بزم اقبال کا جائزہ۔لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،۲۰۰۹ء۔۲۰۱۱ء

۳۔ محمد حامد علی،Glimpses of iqbal,s mind and thought(حامد حسن بلگرامی کی کتاب کا اُردو ترجمہ)۔لاہور:جی سی یو[زیرِنگرانی:محمد شفیق عجمی]

مقالات پی ایچ۔ڈی

۱۔ ایوب صابر۔علامہ اقبال کی شخصیت اور فکروفن پر اعتراضات۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۲۰۰۲ء۔[زیرِنگرانی:رفیع الدین ہاشمی]

۲۔ بشریٰ شریف۔خطبات اقبال کے اُردو تراجم وتوضیحات کا تحقیقی مطالعہ۔لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،۱۲۔۲۰۰۹ء

۳۔ پروین فیروز حسن۔ "The political philosophy of Iqbal" لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۷ء۔[زیرِنگرانی:ڈاکٹر منیر الدین چغتائی]

۴۔ شگفتہ بیگم "Iqbal and Reconstruction of Islamic thought"۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۲۰۰۲ء۔[زیرِنگرانی:عبدالخالق]

۵۔ صدیق جاوید۔فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ۔لاہور :پنجاب یونیورسٹی،۱۹۸۴ء۔[زیرِنگرانی:عبادت بریلوی]

۶۔ علی رضا طاہر۔ Iqbal and persian philosophy,critical

study of the development of metaphysis in persia۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۹۶ء۔[زیرنگرانی:عبدالخالق]

۷۔ محمد معروف۔ Iqbal,s philosophy of knowledge ,A religious critical approach to iqbal,s position on experience as a source of knowledgeلاہور:پنجاب یونیورسٹی،۱۹۶۸ء۔[زیرنگرانی:غلام صادق]
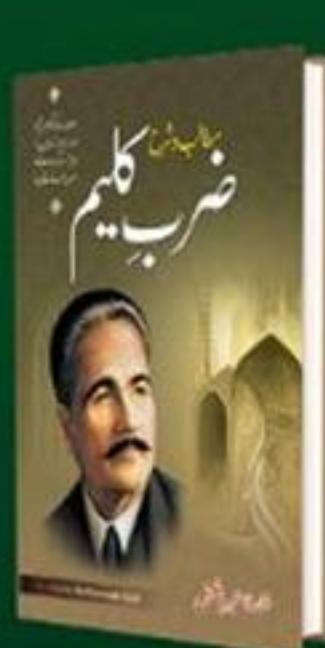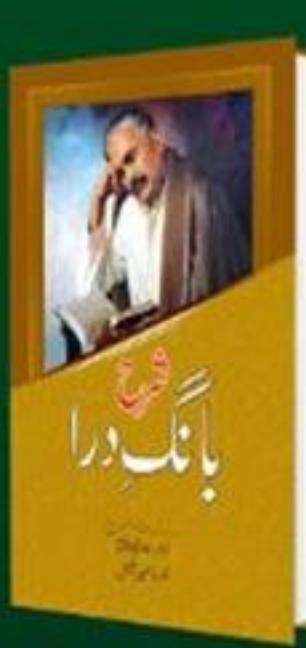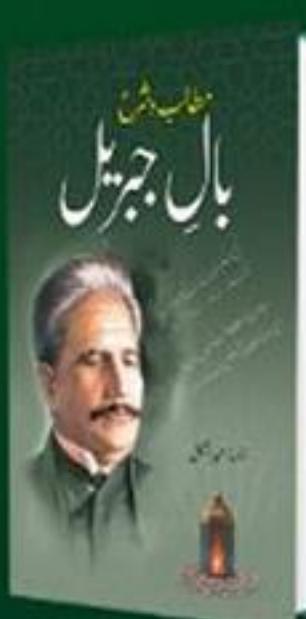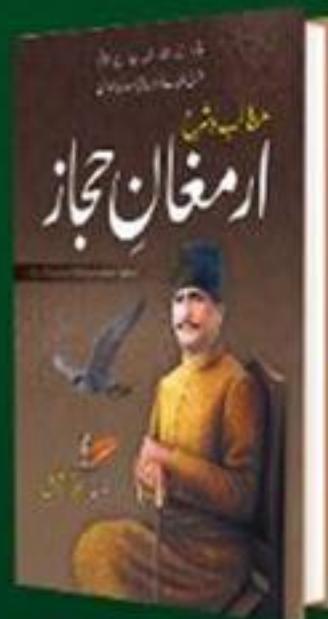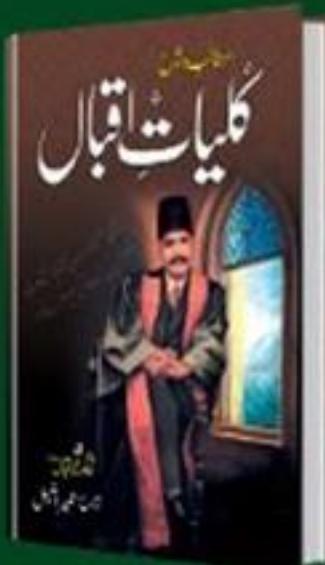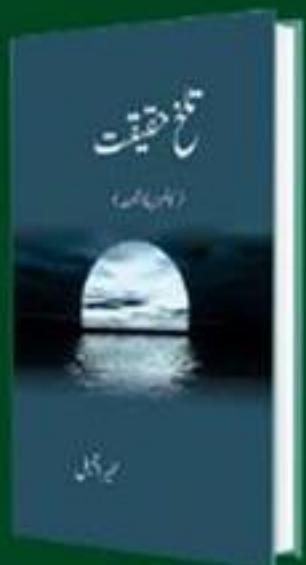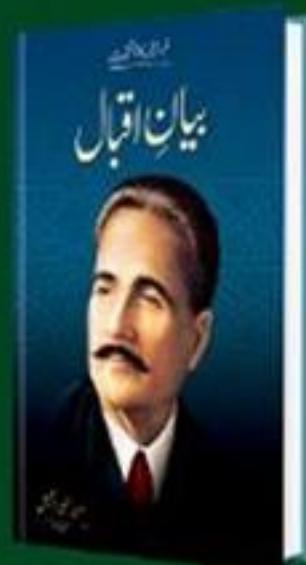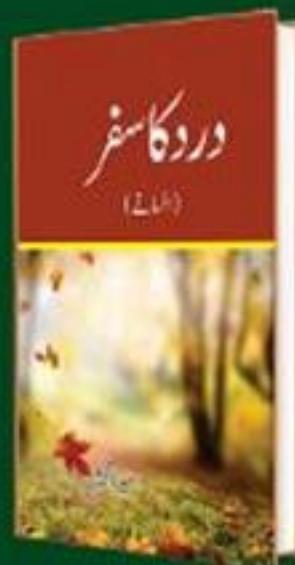
۸۔ ناہید سلطانہ۔کلامِ اقبال میں اعلام و اماکن کی فکری اہمیت۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۹ء۔[زیرنگرانی:افتخار احمد صدیقی]

حمیرا جمیل کی دیگر کتب

دعا پبلی کیشنز
الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور
فون: 0300-9476417 / 042-37233585
E-mail:duapublications@gmail.com